177

نامعلوم سائنس دان

اشتیاق احمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سیریز

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید

177

نامعلوم سائنس دان

اشتیاق احمد

ناشر : طاہر ایس ملک
تزئین : محمد سعید نامدار
سرورق : انداز

اس ناول کے تمام واقعات، مقامات اور کردار فرضی ہیں۔ کسی قسم کی مشابہت یا مطابقت محض اتفاقی امر ہوگی جس کے لیے مصنف یا پبلشر ذمہ دار نہ ہوں گے۔

طاہر ایس ملک
نے (اسعد علی) الا عبدالرشید پرنٹرز، لاہور
سے چھپوا کر
انداز پبلی کیشنز (مطبوعات اشتیاق) لاہور
سے شائع کی۔

قیمت : ۱۵/- روپے

مطبوعات اشتیاق
۷۲/ش نصیر آباد، مسلم پورہ، سانڈہ کلاں لاہور
فون : ۴۲۳۹۳۵۹ — ۷۱۱۲۹۶۹۔

ANDAZ

انداز پبلی کیشنز
سیکنڈ فلور میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور۔

حدیث شریف

حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے اس اُمت میں مریم پیدا ہوئیں، مریم بنت عمران ساری اُمت کی عورتوں میں بہتر تھیں اور اس اُمت کی عورتوں میں خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سب سے بہتر ہیں۔

(بخاری، مسلم)

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ

- یہ وقت نماز کا تو نہیں —
- آپ کو سکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا —
- کل آپ کا کوئی ٹسٹ یا امتحان تو نہیں —
- آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا —
- آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔

اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول الماری میں رکھ دیں۔ پہلے نماز اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیں، پھر ناول پڑھیں۔ شکریہ!

مخلص:

اشتیاق احمد

دو باتیں

السلامُ علیکم

نا معلوم سائنس دان پڑھتے وقت اگر آپ کو ایک عدد خاص نمبر کا مزا نہ آئے تو پیسے واپس، مطلب یہ نہیں کہ میں آپ کو ناول کے پیسے واپس دے دوں گا۔ یا آپ اپنے بک سٹال والوں سے اپنے پیسوں کا مطالبہ کرتے نظر آئیں گے۔ جی نہیں — "پیسے واپس" یہ دراصل رُعب جمانے کا ایک پُرانا طریقہ ہے — یہ رُعب ڈالنے کی ضرورت مجھے اس لیے پیش آ گئی کہ آپ ناول پڑھنے سے پہلے ہوشیار ہو جائیں — کہیں بے خبری میں عام ناول سمجھ کر پڑھ گئے

تو دوبارہ پڑھنا پڑے گا۔ اور اس طرح تیسرا ناول آپ دیر سے پڑھیں گے۔ لہٰذا میرا کاروبار متاثر ہو گا۔ اس لیے میں نے یہی کرنا مناسب خیال کیا۔ مزا نہ آئے تو پیسے واپس۔ آج تک پیسے کسی کو واپس دیتے دیکھا ہے آپ نے۔ دیکھا ہو تو مجھے بھی بتا دیجیے گا۔ شکریہ!

کیا سے کیا ہو گئیں

فون کی گھنٹی بجتے ہی فاروق نے نعرہ لگایا:

"یہ فون ضرور صدرِ مملکت کا ہے۔"

"بھئی فون کی گھنٹی بجی ہے۔ دروازے کی نہیں۔ دروازے کی گھنٹی بجانے کا اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ ہر ایک کی آواز بھی مختلف نکلتی ہے، لہٰذا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ گھنٹی بجانے والا کون ہے۔ لیکن جہاں تک تعلق ہے، فون کی گھنٹی کا۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ فون کس کا ہے۔" محمود نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

"چلو یوں ہی سہی۔ اتنی لمبی چوڑی تقریر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"تم دونوں بھی عجیب ہو۔ فون کا ریسیور اٹھا نہیں رہے۔ اور باتیں بگھارے جا رہے ہو۔" فرزانہ نے پاؤں

پٹخے اور خود فون کی طرف بڑھی، لیکن اس سے پہلے محمود نے
جھپٹ کر فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو — محمود بول رہا ہوں۔"

"ریسیور جمشید کو دو۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"جی — وہ نہا رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

"اچھی بات ہے محمود۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

ریسیور رکھ کر محمود خالی خالی نظروں سے فاروق کو
دیکھتا رہا:

"خیر تو ہے؟" فاروق گھبرا گیا۔

"یار تم نجومی تو نہیں ہو؟" محمود بڑبڑایا۔

"نن — نہیں تو۔" فاروق بولا۔

"کیا مطلب — کیا فون صدر صاحب کا تھا؟" فرزانہ اچھل پڑ[ی]

"ارے!" فاروق کے منہ سے نکلا۔

"کیا ہو گیا بھئی تم لوگوں کو؟" انسپکٹر جمشید غسل خانے
سے نکلتے ہوئے بولے۔

وہ ابھی ابھی دفتر سے لوٹے تھے — اُن کی عادت تھی ک[ہ]
دفتر سے آنے کے بعد سب سے پہلے غسل کرتے تھے اور پھر ا[ن]
کے ساتھ چائے پیتے تھے:

"جج — جی — وہ صدر صاحب کا فون تھا۔"

"تو کیا ہوا بھئی — فون ہی آیا ہے نا — کوئی ہوّا تو نہیں
کھڑا ہو گیا۔" انسپکٹر جمشید نے بُرا سا منہ بنایا۔

"ہوّا کھڑا ہوتے کیا دیر لگتی ہے ابا جان۔" فرزانہ مسکرائی۔

"ہاں! یہ تو خیر ٹھیک ہے — وہ بولے اور آگے بڑھ کر
ریسیور اُٹھا لیا، اب وہ جلدی جلدی صدر صاحب کے نمبر
ملا رہے تھے، سلسلہ ملتے ہی انھوں نے کہا:

"انسپکٹر جمشید حاضر ہے سر۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" دوسری طرف سے صدر صاحب
نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

انسپکٹر جمشید مُسکرائے اور ان کی طرف دیکھا۔

"صدر صاحب نے شاید بہت ہی مختصر بات کی ہے؟"

"ہاں! انھوں نے فرمایا ہے، میں بھی یہی چاہتا ہوں۔"
انھوں نے بتایا۔

"جی — کیا مطلب — کیا چاہتے ہیں وہ؟"

"میں نے فون پر کہا تھا نا کہ — میں حاضر ہوں سر۔" وہ
بولے۔

"اوہ — اس کا مطلب ہے — انھوں نے آپ کو فوراً حاضر
ہونے کا حکم دیا ہے۔" فرزانہ نے چونک کر کہا۔

"ہاں! لو بھئی چلا۔"

"ارے۔ تو کیا ہمیں ساتھ نہیں لے جائیں گے۔" محمود نے فوراً کہا۔

"صدر صاحب کے حکم سے یہ ظاہر نہیں ہوا کہ وہ تم لوگوں کو بھی میرے ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں، لہٰذا انتظار کرو۔" یہ کہتے ہوئے وہ باہر کی طرف لپکے۔

"دھت تیرے کی۔" محمود نے جھلا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

"یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔"

"کوئی بات نہیں بھئی۔ انتظار کر لیتے ہیں۔" فاروق بولا۔

"ہاں! اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔"

"کم از کم چائے ضرور پی سکتے ہو۔" بیگم جمشید نے باورچی خانے سے نکلتے ہوئے کہا اور پھر انھوں نے چائے کی ٹرے ان کے سامنے رکھ دی۔

"ابا جان کو تو آنے دیں امی جان۔" فرزانہ بولی۔

"ان کے جلد واپس آنے کا کوئی امکان نہیں۔" بیگم جمشید مسکرائیں۔

"یا اللہ رحم۔ کیا آپ بھی نجومی بننے والی ہیں۔" محمود گھبرا گیا۔

"ارے نہیں۔ یہ میرا اندازہ ہے۔ اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ یہ گھر اندازے لگانے کا کتنا ماہر ہے۔"

"ہوں! بات تو ٹھیک ہے۔ آؤ بھئی۔ پھر چائے پی ہی لیں۔" فاروق بولا۔

لیکن بیگم جمشید کا اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ وہ ابھی چائے پی کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ انسپکٹر جمشید آ گئے۔ ان کے چہرے پر دبے دبے جوش کے آثار تھے۔

"معلوم ہوتا ہے۔ کوئی دل چسپ کام مل گیا آپ کو۔" فرزانہ نے ان کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمھارا اندازہ ٹھیک ہے۔"

"آج شاید اندازوں کا دن ہے۔" فاروق بڑبڑایا۔

"کیوں۔ کیا تم نے بھی اس بارے میں کچھ اندازے لگائے ہیں؟" انھوں نے حیران ہو کر کہا۔

"کس بارے میں؟" فاروق چونکا۔

"اس بارے میں کہ صدر صاحب نے مجھے کس لیے بلایا ہے۔"

"خیر۔ ہم نے اس پہلو پر تو کوئی اندازہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔"

"لیکن۔ یہ بات بہت ہی دل چسپ ہو گی۔ اگر تم یہ اندازہ لگا کر دکھا دو۔"

"اوہ۔ اگر آپ کہتے ہیں تو ہم کوشش کر دیکھتے ہیں۔" محمود نے فوراً کہا۔

از کم میں اس مقابلے میں حصہ نہیں لوں گا — میرا
اندازہ پہلے ہی فیل ہو چکا ہے۔"

"مجھے تمھارے اندازے سے ہمدردی ہے بیگم — ویسے وہ
اندازہ تھا کیا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"یہ کہ آپ جلد نہیں لوٹیں گے۔"

"اوہ — واقعی — یہ اندازہ تو غلط ہو گیا — خیر کوئی بات
نہیں — زندگی رہی تو اور بہت اندازے لگانے کے مواقع
ملیں گے۔" انھوں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

"آپ تو اس طرح کہہ رہے ہیں ابا جان جیسے ہم اندازے
لگانے کے لیے ہی تو پیدا ہوئے ہیں۔"

"ہم صرف اللہ کی عبادت کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔" انھوں
نے کہا۔

"تو — کیا ابا جان — یہ سراغ رسانی کے کام عبادت ہیں؟"

"اسلام کی سربلندی کے لیے جو کام بھی کریں گے،
عبادت ہے — حلال روزی کمانا بھی عبادت ہے — اپنے بال
بچوں پر خرچ کرنا بھی عبادت ہے — دوسروں کے کام
آنا بھی عبادت ہے — عبادت صرف نماز روزے کا ہی نام
نہیں۔" انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

"ارے — کیا آپ ہمیں بتانا نہیں چاہتے۔" فرزانہ چونکی۔

"کیا بتانا نہیں چاہتا۔"

"یہ کہ صدر صاحب نے کس لیے بلایا تھا۔"

"ضرور بتاؤں گا — پہلے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر
لو — تاکہ دیواروں کے کانوں کی طرف سے کوئی خطرہ نہ رہے۔"

"اوہ — تو بات اس حد تک راز کی ہے۔"

"اس سے بھی دو ہاتھ آگے۔"

"تب تو ہم خاص انداز سے دروازے بند کریں گے۔"

خاص انداز سے دروازے بند کرکے وہ ان کے گرد
جمع ہو گئے۔

"اب میں تم لوگوں کو لکھ کر دوں گا۔"

"جی کیا مطلب — کیا اس بات کا بھی امکان ہے کہ
آپ کی آواز باہر کہیں سن لی جائے گی۔"

"ہاں بالکل — زبردست امکان ہے — اگرچہ یہ ضروری
نہیں۔"

"چلیے — پھر یوں ہی سہی۔"

انھوں نے کاغذ قلم سنبھالا اور لکھنے لگے — وہ ساتھ
ساتھ پڑھتے چلے جا رہے تھے۔

ان کی آنکھوں میں حیرت اور چہروں پر جوش طاری
ہوتا جا رہا تھا۔

★

میک اَپ روم میں انسپکٹر جمشید کچھ اس طرح مصروف
تھے جیسے انھیں دُنیا کا کوئی اور کام نہ ہو۔ آج جتنا اہتمام
میک اَپ میں اُنھوں نے کیا، بہت کم موقعوں پر کیا ہو
گا۔ قریباً دو دو گھنٹے ہر ایک کے چہرے پر صرف کیے،
اس طرح کُل آٹھ گھنٹے میک اپ روم بند رہا اور جب
میک اَپ روم کا دروازہ کھلا تو بیگم جمشید چوکھٹ سے ٹیک
لگائے سو رہی تھیں۔ نہ جانے انتظار کرتے کرتے کب
ان کی آنکھ لگ گئی تھی، حالاں کہ انھیں ایسا کرنے کی
کوئی ضرورت نہیں تھی۔

"بیگم۔ یہ سونے کی کون سی جگہ ہے۔ اُٹھو۔" وہ انھیں
ہلاتے ہوئے بولے۔

"ارے۔ مم۔ میں۔ سو گئی تھی۔" بیگم جمشید نیند میں
بولیں۔

"ہاں! لیکن یہاں سونے کی کیا ضرورت تھی؟"

"مجھے ایک خوف محسوس ہوا تھا۔" وہ بولیں۔

"یہ آپ کیا کہ رہی ہیں امی جان۔ خوف اور آپ کو؟"

"ہاں! یہ خوف کہ کہیں آپ مجھ سے ملے بغیر ہی مہم پر
روانہ نہ ہو جائیں۔"

"لیکن امی جان۔ دروازے کو تو اندر سے آپ ہی بند
کرتیں۔ اور اس کے لیے ہمیں آپ کو اٹھانا پڑتا۔"

"نہیں۔ مجھے اٹھائے بغیر بھی جا سکتے تھے۔" بیگم جمشید
نے کہا۔

"خیر۔ آپ کی تدبیر کارگر رہی۔ لیجیے۔ ہم جا رہے
ہیں۔"

"ارے۔ یہ۔ یہ آپ کی شکلیں کیا سے کیا ہو گئیں۔
ہائیں۔ یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔" انھوں نے آنکھیں
پھاڑ کر ان کی طرف دیکھا۔

"بس دیکھ لیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔" فرزانہ مسکرائی۔

بیگم جمشید دیکھ رہی تھیں۔ انسپکٹر جمشید اس وقت
ادھیڑ عمر نظر آ رہے تھے۔ ان کی بھنویں تک سفید نظر آ
رہی تھیں۔ چہرے کے نقوش اس حد تک تبدیل ہو چکے
تھے کہ خان رحمان اور پروفیسر داؤد تک غور سے دیکھنے
کے باوجود انھیں نہیں پہچان سکتے تھے۔ یہاں تک کہ اکرام
بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔ جو ہر وقت ان کے قریب رہتا
تھا۔ یہی حال محمود، فاروق اور فرزانہ کا تھا۔ ان کے

نقوش اس قدر بدل گئے تھے کہ ان کے قریبی کلاس فیلو بھی انہیں نہیں پہچان سکتے تھے۔ فرزانہ کو بھی لڑکا بنا دیا گیا تھا۔ اب وہ تینوں کھلنڈرے لڑکے نظر آ رہے تھے۔

"بیگم تم نے ٹھیک ہی کہا۔ میں تو واقعی تمہیں سوتے سے نہ جگاتا۔ خیر اب ہم رخصت ہوتے ہیں۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے۔ اس وقت اس میک اپ میں یہاں سے نکلتے ہمیں کوئی نہیں دیکھے گا۔ اور ایک بار ہم اس گھر سے فاصلے پر پہنچ جائیں، پھر کوئی ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھے۔ نہیں پہچان سکے گا۔"

"آپ نے بتایا نہیں۔ جانا کہاں ہے۔"

"یہ نہیں بتایا جا سکتا۔ صرف ان تینوں کو بتایا ہے۔ وہ بھی اس لیے کہ یہ پوری طرح ہوشیار رہیں۔ مہم کو معمولی خیال نہ کریں۔"

"چلیے ٹھیک ہے۔ یہ تو بتا دیں کہ واپسی کا کب تک امکان ہے؟"

"ہاں! امید کی جا سکتی ہے کہ ایک ہفتہ لگ جائے گا۔" وہ بولے۔

"شکریہ۔ اب آپ جائیں۔ اللہ آپ سب کا حامی و ناصر ہو۔" بیگم جمشید نے جذباتی آواز میں کہا۔

"آمین!" انھوں نے ایک ساتھ کہا۔

پھر وہ پائیں باغ والی کھڑکی کے ذریعے باغ میں اترے اور جھک کر چلتے سڑک پر آ گئے۔ سڑک پر آنے سے پہلے انھوں نے بہت دیر تک دور دور کا جائزہ لے لیا تھا کہ کوئی موجود تو نہیں۔ اطمینان کر لینے کے بعد وہ سڑک پر آ گئے اور ایک کنارے پر ہو کر چلنے لگے۔ ان کے پاس اپنی پہچان کا بھی کوئی کاغذ نہیں تھا۔ نہ ہی نئے میک اپ کے مطابق کاغذات تھے۔ اور جہاں وہ جا رہے تھے، وہاں کاغذات کے بغیر ایک منٹ بھی گزارنا مشکل تھا۔ اس کے باوجود وہ بے دھڑک قدم اٹھا رہے تھے۔ بیرونی سڑک پر آ کر انھوں نے دائیں بائیں دیکھا۔ سڑک دور دور تک سنسان پڑی تھی۔ پھر وہ دائیں طرف چل پڑے۔ پندرہ منٹ تک سفر کرنے کے بعد ایک ٹیکسی ان کے قریب سے گزری۔ انھوں نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

"کہاں جائیے گا صاحب؟" ٹیکسی ڈرائیور نے خود ہی پوچھا۔

انسپکٹر جمشید نے اسے نظر بھر کر دیکھا، پھر خاموشی سے ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ اور ٹیکسی پوری رفتار پر چل پڑی۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کو بہت حیرت ہوئی۔ ان

کے والد نے ڈرائیور کو یہ نہیں بتایا تھا کہ کہاں جانا ہے۔ اور ان کے بیٹھنے کے بعد نہ ڈرائیور نے ہی پوچھا تھا کہ کہاں لے چلوں۔ انھوں نے گھبرا کر اپنے والد کی طرف دیکھا۔

لیکن وہ تو بھرپور انداز میں مسکرا رہے تھے۔

بیگم جمشید

ایک کمرے میں رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ کمرے میں کوئی گہری نیند سو رہا تھا، پہلی گھنٹی کی آواز اسے کیا جگاتی۔ پانچویں مرتبہ گھنٹی کے بجنے پر اس کے کان پر جوں رینگی۔ لیٹے لیٹے اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا اور پھر ناخوشگوار اور تیز آواز میں بولا:

"میں اپنی نیند حرام کرنے والے کا نام جاننا چاہتا ہوں۔"

"زوکن۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

لیٹے ہوئے شخص کو ایک کرنٹ لگا، اچھل کر کھڑا ہو گیا اور کانپ کر بولا:

"مم۔ میں معافی چاہتا ہوں باس۔"

"اب معافی کا کیا سوال۔ سزا تو ملے گی۔ ایک تو تم گھوڑے بیچ کر سوتے ہو، دوسرے ریسیور اٹھا کر بولنے سے پہلے یہ بھی نہیں سوچتے کہ فون پر میں بھی ہو سکتا ہوں۔

میں تمھیں کتنی تنخواہ دے رہا ہوں شبانی ؟"

"سات ہزار روپے ماہانہ۔ اس کے علاوہ دو بونس۔ جو کام میرے ذمے لگایا جائے، اس سلسلے میں ہونے والے اخراجات بھی آپ ادا کرتے ہیں۔"

"اور تم کتنے عرصے سے میرے مُلازم ہو؟" کہا گیا۔

"دو سال سے۔" اس نے کہا۔

"دو سال میں مَیں نے کتنی مرتبہ تم سے کام لیا ہوگا؟"

"دس یا گیارہ مرتبہ۔"

"گویا میں نے دس یا گیارہ مرتبہ کام لینے کے اب تک تمھیں تقریباً دو لاکھ روپے دیلے ہیں۔ اگر یہ دس گیارہ کام میں کسی سے ٹھیکے پر کراتا تو شاید پچاس یا ساٹھ ہزار میں ہو جاتے۔ مطلب یہ کہ تمھیں ڈیڑھ لاکھ روپے زائد دیے گئے۔ کس لیے۔ صرف اس لیے کہ مستقل آدمی مَوجود ہو، وقت پر کسی کو تلاش کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ اور تمُھاری جب ضرورت پڑتی ہے، تو جواب میں نیند حرام کرنے والا کا خطاب ملتا ہے۔ شبانی! اگر میں ماہوار تمھیں ایک پیسہ بھی نہ دوں تو بھی تمھیں۔ میرا ہر کام کرنا پڑے گا۔ کرنا پڑے گا یا نہیں؟"

"جب۔ بالکل کرنا۔ جب۔ پڑے گا باس۔" شبانی نے لرزتی

آواز میں کہا:

"کیوں شبانی۔ مَیں تمھیں یاد کرا دوں۔ تم ایک قاتل ہو۔ پولیس کو اس تاجر کے قاتل کی تلاش آج تک ہے۔ جس کے گھر سے ڈیڑھ کروڑ روپے کے ہیرے چرائے گئے تھے، اور رخصت سے پہلے اس نے تاجر کو بھی قتل کر دیا تھا، کیوں کہ تاجر اس کا چہرہ دیکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا، لیکن پولیس کو اس قاتل اور چور کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ البتّہ میں ضرور جانتا ہوں، نہ صرف جانتا ہوں، بلکہ اس کے خلاف تمام ثبوت بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان حالات میں بھی اگر میں تمھیں سات ہزار روپے ماہانہ معاوضہ دیتا ہوں تو۔ تمھیں تو غلاموں سے بھی زیادہ بڑھ کر خدمت گزار ہونا چاہیے، نہ کہ گستاخ۔"

ڈگن کا لہجہ سرد ہوتا جا رہا تھا۔

"م۔ معاف کر دیجیے سر۔ غلطی ہو گئی۔ آئندہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔"

"شبانی! معاف کرنا مجھے نہیں آتا۔ آج کے بعد تمُھاری تنخواہ صرف ڈیڑھ ہزار روپے ماہوار ہو گی، لیکن کام کے معاملے میں تم پہلے سے بہت چوکس ہو گے۔"

"یہ۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں باس؟"

"بس! میں دوسرا لفظ نہیں سنا کرتا۔ ابھی اور اسی وقت فلاحی چوک پر پہنچ جاؤ۔ وہاں ایک آدمی خود تم سے ملاقات کرے گا اور کام کی تفصیل بتائے گا۔ میں نے اسے ہدایت دے دی ہے۔ تم اس پر عمل کرو گے۔ آیندہ ایسا ہوا تو یہ ڈیڑھ ہزار بھی نہیں ملیں گے۔"

"بب۔ باس۔ میں۔ میں تو مر جاؤں گا بے موت۔ ڈیڑھ ہزار سے تو میرا ایک ہفتہ بہت مشکل سے گزرے گا۔" شبانی نے کہا۔

"اس معاملے میں اب کوئی ردّ و بدل نہیں ہوگا شبانی، فوراً روانہ ہو جاؤ۔"

دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ شبانی چند سیکنڈ تک تو ریسیور کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا رہا، پھر اسے پٹخ دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

اسے فلاحی چوک پہنچنے میں صرف پندرہ منٹ لگے۔ ایک شخص ایک کھمبے کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ وہ تیر کی طرح اس کی طرف گیا:

"اوہو۔ روگو۔ تم ہو۔"

"ہاں! باس نے یہاں پہنچنے کا حکم دیا تھا، لیکن مجھے یہ امید نہیں تھی کہ یہاں تم سے ملاقات ہوگی۔ یہ جان کر

اور بھی حیرت ہوئی کہ تم بھی باس کے لیے کام کرتے ہو۔ کیا کوئی قتل وتل کر بیٹھے تھے؟" روگو نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

"اس۔ اس کا مطلب ہے۔ تم نے بھی قتل کر دیا تھا کسی کو اور اب اس کا راز باس کے پاس محفوظ ہے؟" شبانی بولا۔

"ہاں! یہی بات ہے۔"

"روگو۔ آخر یہ باس کون ہے۔ یہ کب تک ہمیں انگلیوں پر نچاتا رہے گا؟" شبانی نے حسرت زدہ آواز میں کہا۔

"میں نہیں جانتا۔ ہمیشہ اس نے فون پر رابطہ قائم کیا ہے۔ مجھے تو اس کا نمبر تک معلوم نہیں، پھر اس کے بارے میں کس طرح بتا سکتا ہوں؟"

"میرا بھی یہی حال ہے۔ وہ دن کتنے اچھے تھے۔ جب ہم آزاد تھے۔ جہاں چاہتے تھے، واردات کرتے تھے اور عیش کرتے تھے۔ اب تو صرف وہ کام کرتے ہیں۔ جس کا اس نے حکم دیا ہوتا ہے۔"

"اپنے ساتھ بھی ایسا ہی ہے پیارے۔ خیر اب حالیہ کام کی بات ہو جائے۔ اس وقت ہمیں کیا کرنا ہے۔ باس نے مجھے بتایا ہے کہ آج چند گھنٹے پہلے صدر نے انسپکٹر جمشید کو بلایا تھا۔ طلبی اچانک ہوئی تھی۔ ملاقات

بھی صرف چند منٹ ہوئی، پھر انسپکٹر جمشید کو تیزی کے
عالم میں اپنے گھر جاتے ہوئے دیکھا گیا، لیکن رات
گئے تک اسے گھر سے نکلتے نہیں دیکھا گیا۔ نگرانی کرنے
والا بارہ بجے کے قریب واپس آ گیا تھا، کیوں کہ بارہ
بجے باس کو اس سے رپورٹ طلب کرنا تھی۔ رپورٹ سُن کر
باس نے مجھے فون کیا۔ اور پھر تمھیں۔ اب باس جاننا
چاہتا ہے کہ صدر نے انسپکٹر جمشید کو کیوں بلایا تھا۔ اور
اب انسپکٹر جمشید کہاں ہے۔"

"کام کچھ آسان نہیں، کیوں کہ انسپکٹر جمشید بہت خطرناک
آدمی ہے۔" شانی بڑبڑایا۔

"لیکن ہمیں کرنا ہے۔"

"ہاں! روگو۔ باس تمھیں کتنی تنخواہ ہر ماہ دے رہا ہے؟"

"تین ہزار روپے۔ اور تمھیں؟"

"تھوڑی دیر پہلے تک میری تنخواہ سات ہزار روپے تھی۔
اب ڈیڑھ ہزار روپے رہ گئی ہے۔"

"اوہ!" روگو حیرت زدہ انداز میں بولا۔

"کیوں۔ تم نے یہ سُن کر پوچھا نہیں کہ ایسا کیوں ہے؟"

"پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ میں بھی ان حالات سے
گزر چکا ہوں۔ تنخواہ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔"

"ہوں! خیر۔ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔"

"آؤ پہلے تو ذرا پبلک فون بوتھ کے ذریعے کچھ کام
کر لیں۔"

دونوں ایک پبلک فون بوتھ میں داخل ہوئے۔ روگو
نے انسپکٹر جمشید کے گھر کے نمبر ڈائل کیے۔ تیسری گھنٹی پر
کسی نے ریسیور اٹھایا اور ایک عورت کی آواز سُنائی دی:

"ہیلو۔ کون صاحب؟"

"انسپکٹر جمشید صاحب سے بات کرنی ہے۔ مہربانی فرما کر
ریسیور انھیں دے دیں۔"

"وہ گھر نہیں ہیں۔"

"تو پھر محمود صاحب کو جگائیں۔"

"وہ تینوں بھی گھر میں نہیں ہیں۔"

"اوہو اچھا۔ لیکن گئے کہاں ہیں؟"

بیگم جمشید یہ سوال سُن کر مسکرائیں، پھر بولیں:

"آخر آپ کون ہیں۔"

"میں ان کا ایک دوست ہوں۔ شاکر میرا نام ہے۔
اور انھیں ایک ضروری پیغام دینا ہے۔"

"پیغام آپ مجھے دے دیں۔" وہ بولیں۔

"افسوس۔ میں پیغام آپ کو نہیں دے سکتا۔ خیر، ہم کچھ
دیر بعد فون کریں گے۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہو گا — ان کے کچھ دیر بعد آنے کا
کوئی امکان نہیں۔" انھوں نے منہ بنا کر کہا۔

"شکریہ!" روگو نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا، پھر شبانی سے
بولا:

"انسپکٹر جمشید اور اس کے بچے گھر میں نہیں ہیں — اور
ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کہاں ہیں — اب کیا کریں۔
اور کیا نہ کریں؟"

"بیگم صاحبہ سے ملاقات کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔"

"ہاں! ٹھیک ہے — آؤ۔"

شبانی یہاں تک اپنی موٹر سائیکل پر آیا تھا — روگو کی
بھی موٹر سائیکل وہیں موجود تھی — دونوں ان پر بیٹھ کر
انسپکٹر جمشید کے گھر کی طرف روانہ ہوئے — گھر سے کچھ
فاصلے پر رک کر انھوں نے موٹر سائیکلوں کے انجن بند کیے
اور پیدل آگے بڑھے، پھر شبانی نے دروازے پر دستک
دی —

ایک منٹ بعد قدموں کی چاپ سنائی دی، پھر بیگم جمشید
نے دروازہ کھولے بغیر کہا:

"کون؟"

"انسپکٹر جمشید صاحب سے ملنا ہے — ہم ان کے دوست ہیں۔"

"آپ کے نام؟" وہ بولیں۔

"اختر اور منیر۔"

"اس نام کے تو ان کے کوئی دوست نہیں ہیں۔" بیگم جمشید
مسکرائیں۔

"یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں — کیا آپ کو ان کے تمام
دوستوں کے نام معلوم ہیں؟" روگو بولا۔

"ہاں بالکل — ان کے دوست ہیں ہی کتنے — دوست
بنانے کے معاملے میں وہ بہت احتیاط کرتے ہیں — ویسے
مسٹر شاکر — آپ کا یہاں کیا نام ہے؟"

"کک — کیا مطلب۔" روگو ہکلایا۔

"فون کرتے وقت تو آپ نے اپنا نام شاکر بتایا تھا۔"
بیگم جمشید نے کہا۔

"اوہ — دراصل میرا پورا نام شاکر منیر ہے۔" اس نے
جلدی سے کہا۔

"شکریہ — انسپکٹر صاحب گھر میں نہیں ہیں — تشریف لے
جا سکتے ہیں۔"

"اچھی بات ہے — ہم پھر آئیں گے۔" شبانی منہ بنا
کر بولا —

"ضرور — کیوں نہیں۔" انھوں نے جواب دیا۔

روگو اور شبانی دروازے کے پاس سے ہٹ آئے۔
شبانی نے کہا:

"اب کیا کریں؟

"ہمیں کسی نہ کسی طرح گھر کے اندر داخل ہونا
ہے۔تاکہ اس سے یہ معلوم کیا جا سکے کہ انسپکٹر جمشید اُ
بچے کہاں گئے ہیں۔"

"ہوں، ٹھیک ہے۔آؤ۔ پہلے مکان کا ایک چکر
لگائیں۔ شاید اندر داخل ہونے کا کوئی راستا نظر آ
جائے۔" شبانی بولا۔

چکر لگانے کے بعد وہ دیوار پر چڑھ کر پائیں باغ میں
آ گئے۔ پہلے کھڑکی پر دباؤ ڈالا، پھر درختوں کا جائزہ لی

"میرا خیال ہے۔ہم اس درخت کی شاخ کے ذریعے
چھت پر اُتر سکتے ہیں۔" روگو نے کہا۔

"ہاں! ایسا ہو سکتا ہے۔آؤ۔"

دونوں درخت پر چڑھنے لگے۔آخر چھت پر اُتر گئے
چند سیکنڈ تک سانس لینے کے بعد وہ زینے پر آئے، لیکن
دروازہ دوسری طرف سے بند تھا۔

"اب کیا کریں؟" روگو نے کہا۔

"کسی طرح نیچے نکلنا ہو گا۔" شبانی نے فوراً جواب دیا

"عادت کے مطابق میری جیب میں ریشم کی ڈور کا گولا
موجود ہے۔" روگو بولا۔

"بہت خوب۔تب تو بن گیا کام۔"

دونوں اس قسم کے کاموں کے ماہر تھے۔اس لیے
منڈیرے نیچے اُترنا ان کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوا:

صحن میں اترتے ہی انھوں نے چاروں طرف ایک نظر
ڈالی۔ایک کمرہ روشن تھا۔وہ دبے پاؤں اس کی طرف
بڑھے۔دروازے پر دباؤ ڈالا۔تو کھلتا چلا گیا، لیکن
کمرہ تو خالی پڑا تھا۔اب انھوں نے ایک ایک کر کے
سب کمرے دیکھ ڈالے، لیکن بیگم جمشید کہیں بھی نظر نہ آئیں:

"حیرت ہے۔یہ چالاک عورت آخر کہاں چھپ گئی؟" روگو
نے کہا۔

"یہ اس کا گھر ہے۔وہ اس گھر سے ہماری نسبت بہت
زیادہ واقف ہے۔" شبانی بولا۔

"اس کا مطلب ہے۔ہمیں پورے گھر کو اچھی طرح
چھاننا پڑے گا۔"

"ہوں! آؤ۔اب ہم ایک ایک گوشہ دیکھیں گے۔"

وہ ایک ایک گوشہ دیکھتے پھرے۔آخر میں ان کی نظر
بیرونی دروازے پر پڑی:

"ارے۔ دروازہ تو اندر سے بند نہیں ہے۔" روگو کے منہ سے نکلا۔

"اس۔ اس کا مطلب ہے۔ جب ہم اندر داخل ہو چکے تو بیگم جمشید دروازہ کھول کر باہر نکل گئی؟"

"اوہ! اوہ!" روگو کے منہ سے نکلا۔

پھر دونوں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھے۔ اور ٹھٹک کر رہ گئے۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔

رنگ برنگا سفر

"آپ نے انہیں بتایا نہیں، کہاں جانا ہے؟" فاروق سے رہا نہ گیا۔

"اور انھوں نے بھی تو نہیں پوچھا کہ کہاں جانا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی ہاں! یہ بات بھی کم حیرت انگیز نہیں ہے۔" فرزانہ بولی۔

"تو پھر سمجھ جاؤ۔"

"کک۔ کیا سمجھ جائیں؟" محمود نے بوکھلا کر کہا۔

"بس۔ جو جی چاہے۔" وہ بولے۔

"اوہ۔ تو یہ آپ کے اپنے آدمی ہیں۔ اور پہلے سے انہیں معلوم ہے کہ۔"

"بس یہی سمجھ لو۔ اور اب خاموش رہو، کیوں کہ ٹیکسی کی دیواریں بھی کانوں سے محروم نہیں ہوتیں۔"

"اوہ۔ جی ہاں! یہ بات بھی ٹھیک ہے۔"

ان کا سفر دو گھنٹے تک جاری رہا تھا۔ ایک کھلے میدان میں انہیں ایک ہیلی کاپٹر کھڑا نظر آیا۔

"بھئی واہ۔ ہر کام پہلے سے تیار ہے۔" محمود خوش ہو کر بولا۔

"اور بالکل خفیہ طریقے سے۔" فاروق نے کہا۔

"بس دیکھتے جاؤ۔"

ہیلی کاپٹر انہیں لے کر اڑا اور ایک جزیرے میں اتار دیا۔ جزیرے سے انہیں ایک آب دوز لے کر روانہ ہوئی۔ ایک جگہ آب دوز سطح آب پر ابھری۔

"آؤ بھئی۔ اب ہمیں تیر کر جانا ہوگا۔"

"اور تیر کر کس قدر فاصلہ طے کرنا ہوگا۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"زیادہ نہیں۔ کیا تم تھک گئے؟"

"اس مسلسل اور رنگ برنگے سفر سے بھی اگر ہم نہیں تھکیں گے تو پھر کس چیز سے تھکیں گے۔" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

"رنگ برنگا سفر۔ بھئی واہ۔ یہ نام پسند آیا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"لیکن افسوس۔ یہ نام کسی جاسوسی ناول کا نہیں ہو سکتا۔" فاروق بولا۔

"تو ہمیں ضرورت ہی کیا ہے۔ ہم ناول نگار تو نہیں ہیں۔ ناول نگار تو بے کار قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ بیٹھے ہیں۔ سوچ میں گم ہیں۔ ہاتھ میں سگریٹ ہے۔ جس سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ اور دائیں طرف گرم تیز چائے کا کپ رکھا ہے۔ جس سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ ایک کش لگائیں گے۔ ایک گھونٹ بھریں گے۔ اور ایک جملہ لکھ دیں گے۔ اس کے بعد پھر گہری سوچ میں گم ہو جائیں گے۔ اسے کہتے ہیں ادیب۔ مصنف۔ ناول نگار۔" محمود نے جلدی جلدی کہا۔

"تم سے کس نے کہا تھا، ادیب کی تعریف کرنے کے لیے۔"

"کہا تو کسی نے بھی نہیں۔ لیکن۔ ہمارے ملک میں ان دنوں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ میں آج کے ادیبوں کو سنانا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"یہ بات تم نے کب کسی ادیب کو سنائی۔ تم نے تو ادیبوں کی برائیاں گنوائی ہیں۔ یہ کہ وہ بیٹھے وقت ضائع کرتے رہتے ہیں۔" فرزانہ نے کہا۔

"خیر۔ اس میں تو کوئی شک نہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"لیکن اس وقت مسئلہ تیرنے کا ہے۔ نہ کہ اس موضوع پر بحث کرنے کا۔"

انھوں نے آب دوز پر سے چھلانگیں لگا دیں۔ اور ساحل
کی طرف تیرنے لگے۔ تقریباً نصف گھنٹے تک مسلسل تیرنے
کے بعد ان کے سامنے چٹانیں آ گئیں۔

وہ چٹان پر لیٹ گئے۔ تیز ہوا نے ان کے کپڑے
جلد ہی خشک کر دیے۔

"یہاں سے ہمارا اصل سفر شروع ہوتا ہے۔ ہم خالی
ہاتھ ہیں۔ خالی دامن ہیں۔ خوراک بھی حاصل کرنا ہو گی
اور اپنا کام بھی۔"

"خوراک تک تو بات ٹھیک ہے، لیکن جہاں تک بات
ہے کام کی۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں کیا کام کرنا ہے۔ اور
جب تک معلوم نہیں ہو گا۔ ہم کر کیا سکتے ہیں۔" فرزانہ نے
فکر مندانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں! یہ اعتراض بجا ہے۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں
کہ اب تم تینوں کو کام کی نوعیت بتا دینی چاہیے۔"
انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"یہ تو آپ کی بہت ہی مہربانی ہو گی۔" محمود نے فوراً
کہا۔

"یہ ہمارا ایک دشمن ملک ہے۔ اس وقت ہم ملک میں داخل
ہو چکے ہیں۔ یہاں کی پولیس سے بچ کر اندر داخل ہونے

کا یہ راستا ہمارے ملک کے چند خاص سراغ رسانوں نے
تلاش کیا ہے۔ جب تمام انتظامات مکمل کر لیے تو یہ مشن
ہمارے سپرد کیا گیا۔ ابھی جب ہم شہر میں داخل ہوں گے
تو تمھیں تصدیق ہو جائے گی کہ یہ وہی ملک ہے جس کے
بارے میں میں سفر شروع کرنے سے پہلے تمھیں بتا چکا ہوں،
ہم یہاں پہلے بھی آ چکے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ اس ملک
کا ایک سائنس دان ہے۔" انسپکٹر جمشید یہ کہ کر رک گئے۔

"لیکن ابا جان! میرے خیال میں تو یہ کوئی خاص بات
نہیں۔ سائنس دان تو ہر ملک میں ہوتے ہیں۔" فاروق بول اٹھا۔

"ہاں! ٹھیک ہے۔ سائنس دان ہر ملک کے ہوتے ہیں،
تم اپنے ملک کو ہی لے لو۔ ہمارے ملک کے سب سے
زیادہ مشہور اور بڑے سائنس دان کون ہیں؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ہمارے پروفیسر انکل۔"

"بالکل ٹھیک۔ کیا تمھیں ان کا فون نمبر معلوم ہے؟"

"یہ۔ یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ہمیں اور ان کا
فون نمبر معلوم نہ ہو گا۔"

"چلو۔ اور بھی بے شمار لوگوں کو ان کا فون نمبر معلوم
ہے نا؟"

"جی ہاں! کیوں نہیں۔"

"اچھا! ان کی تجربہ گاہ کہاں ہے۔ یہ بات بھی اَن گنت لوگ جانتے ہیں؟"

"جی ہاں! اور کیوں نہ جانیں۔ آخر وہ مُلک کے سب سے بڑے سائنس دان ہیں۔" محمود نے کہا۔

"ان کے دوست، احباب اور رشتے دار سب لوگ جانتے ہیں کہ ان کی تجربہ گاہ کہاں ہے۔"

"ضرور جانتے ہیں۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"تم لوگوں کے لیے ایک بہت ہی عجیب بات ۔ اور وہ یہ کہ ۔ اس مُلک کے سائنس دان کا کسی کو نام معلوم نہیں، پتا معلوم نہیں ۔ اس کا فون نمبر کسی کو کیا معلوم ہو سکتا ہے ۔ اس کے گھر میں فون لگا ہوا ہی نہیں ہے ۔ تو فون کا نمبر کہاں ہوگا ۔ اس کے کسی قریبی عزیز کو بھی یہ بات معلوم نہیں کہ وہ سائنس دان ہے۔ اپنے عزیزوں، رشتے داروں اور واقفوں کے لیے وہ بالکل ایک عام آدمی ہے، اتنا عام کہ اس کے گھر میں فون تک نہیں ہے۔ اب کوئی سوچ سکتا ہے کہ وہ اس ملک کا سب سے بڑا سائنس دان ہے۔ اس کا خفیہ رابطہ اگر ہے تو حکومت کے بہت ہی خاص آدمیوں سے۔ لیکن جب وہ

اس سے ملتے ہیں تو بہت ہی عام آدمیوں کے لباس اور رُوپ میں۔ کسی کو گمان بھی نہیں گزرتا کہ اس کی مُلاقات کتنے بڑے لوگوں سے اور کیوں ہوتی ہے، لیکن یہی شخص ۔ مسلم ممالک کے لیے خطرہ ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے، مسلم ممالک کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کرتا ہے، جو چیز بھی ایجاد کرتا ہے۔ ایسی کرتا ہے ۔ لہٰذا مجھے حکم ملا ہے کہ میں اسے ختم کر دوں۔"

"جی!!!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ہاں! صدر صاحب نے مجھے یہی حکم دیا ہے۔"

"لیکن ابّا جان ۔ ہم اس تک کیسے پہنچیں گے۔ جب کہ اس شخص کا کوئی نام نہیں، کوئی پتا نہیں، اس کا کوئی فون نمبر نہیں، اس کی کوئی گاڑی نہیں، وہ بالکل عام آدمیوں کی طرح اس ملک میں نہ جانے کہاں رہتا ہے ۔ یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ وہ اس شہر میں رہتا ہو۔"

"ہاں! اس کا بھی بہت امکان ہے، لیکن چوں کہ یہ شہر دارالحکومت ہے، اس لیے امکان یہی ہے کہ وہ رہتا کم از کم اسی شہر میں ہے، کیوں کہ حکومت کے خاص آدمی آسانی سے تو اس سے اس شہر میں مل سکتے ہیں۔ اور ایک اندازہ میں نے اور لگایا ہے ۔ وہ

بھی سُن لو۔ جو معلومات ہمیں حاصل ہیں۔ یعنی یہی کہ اس کا کوئی پتا نہیں، اس کی کوئی تجربہ گاہ نہیں۔ اس کا کوئی فون نمبر نہیں۔ اس کے واقف یا عزیز بھی یہ بات نہیں جانتے کہ وہ ایک سائنس دان ہے۔ انھیں بھی اتنی بات معلوم ہے کہ وہ ایک بہت ہی معمولی آدمی ہے۔ لہٰذا ان معلومات کی بنا پر میں نے ایک اندازہ لگایا ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ جہاں کہیں بھی رہتا ہے۔ بالکل تنہا رہتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کا کوئی عزیز، کوئی رشتے دار نہیں رہتا، یہاں تک کہ اس کا کوئی ملازم بھی نہیں ہے۔"

"لیکن ابّا جان! اس بڑے شہر میں۔ تو نہ جانے کتنے ایسے لوگ ہوں گے۔ جو بالکل تنہا رہتے ہوں گے۔ ہم اسے کس طرح تلاش کریں گے۔" فاروق نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"ہمارے مُلک کے بھی یہاں کچھ جاسوس ہیں۔ صدر صاحب یہ کام ان سے بھی لے سکتے تھے۔ میرا مطلب ہے، یہ کام کرنے کا حکم انھیں بھی دے سکتے تھے۔ اور شاید دیا بھی ہو، لیکن وہ ناکام ہو گئے ہوں گے، کیوں کہ جب تک اسے تلاش نہیں کر لیا جاتا، اس وقت تک اسے

ختم نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا کچھ سوچ کر ہی یہ کام ہمارے سپرد کیا گیا ہے۔"

"گویا ہمیں اس شخص کو پہلے تلاش کرنا ہو گا۔" فرزانہ پُرجوش انداز میں بولی۔

"ہاں! لیکن کیسے۔ میرے ذہن میں تو کوئی بات نہیں آ رہی۔ اور پھر ہمارے لیے یہاں قدم قدم پر خطرات بھی ہیں۔" فاروق بولا۔

"ہوں! لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم مایوس ہو جائیں اور واپس چلے جائیں۔ ہمارے ذمّے ایک کام لگایا جا چکا، ہم اس کی ذمّے داری قبول کر چکے۔ اب ہمیں اس کام کو انجام دینا ہے۔ ہماری زندگیاں رہیں یا جائیں۔" انسپکٹر جمشید نے پُرسکون آواز میں کہا۔

"یہ بات تو ہمیں معلوم ہے ابّا جان۔ سوال تو یہ ہے کہ۔"

"بس کچھ سوال نہیں ہے۔ لہٰذا اس کا کوئی جواب بھی نہیں ہے۔ ہم فی الحال شہر میں داخل ہوں گے۔ خوراک اور رہائش کا انتظام کریں گے۔" انھوں نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

"گویا یہاں موجود ہمارے ایجنٹ اس سلسلے میں ہماری مدد کریں گے۔"

"نہیں! ہمارے بارے میں کسی کو بھی نہیں بتایا گیا۔
کسی کو معلوم نہیں کہ ہم اس وقت کہاں ہیں۔ سوائے
صدرِ مملکت کے۔" وہ بولے۔

"چلیے پھر۔ بسم اللہ کریں۔"

"تم لوگ بہت احتیاط کرو گے۔ جب آس پاس لوگ
موجود ہوں تو بات چیت نہیں کرو گے، کیوں کہ اس طرح
ہمیں پہچان لیا جائے گا۔ بس یہ بات ذہن میں رکھو۔
ہم اس وقت سیاحوں کے رُوپ میں ہیں۔ سیاح بھی وُہ
جو ان کی حکومت کے حامی ہیں۔ ایسے حامی سیاحوں کو یہ
اپنے ملک میں داخل ہونے کی اجازت خوشی سے دیتے
ہیں۔ لیکن ان کے پاس کاغذات ضرور ہوتے ہیں۔ جب کہ
ہمارے پاس نہیں ہیں۔"

"کیوں نہیں ہیں۔ کیا آپ جعلی کاغذات تیار نہیں کروا سکتے
تھے؟"

"یہاں پر جعلی کاغذات فوراً پکڑ لیے جاتے ہیں۔ انھوں
نے کچھ ایسے خفیہ اشارات طے کر رکھے ہیں۔"

"تو پھر بغیر کاغذات کے سیاح بھی تو پکڑے جائیں گے۔"

"ہاں! لیکن ہم کیوں پروا کریں۔ ہمیں تو اپنا کام نکالنا
ہے۔ وُہ جیسے بھی نکلے۔ اب آؤ چلیں۔ پہلے مرحلے پر

ہمیں یہاں کی کرنسی حاصل کرنا ہو گی، کیوں کہ اس کے بغیر
ہم نہ کچھ کھا پی سکیں گے اور نہ کہیں رہائش اختیار کر
سکیں گے۔"

"تو یُوں کہیے۔ پہلے مرحلے پر ہمیں چوری کرنا ہو گی۔"

"اسلام دشمنوں کی چوری، وُہ بھی شدید مجبوری کی حالت
میں۔ کوئی بُری بات نہیں۔" انسپکٹر جمشید مُسکرائے۔

"آپ فکر نہ کریں۔ ہم چوری کریں گے۔" فارُوق مُسکرایا۔

"لیکن اس طرح کہ کوئی مسئلہ نہ اُٹھ کھڑا ہو۔"

"جی بہتر!"

آخر وُہ شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ جیبی آئینے کی مدد
سے وُہ اپنے حُلیوں پر ایک نظر ڈال چکے تھے۔ اور پوری
طرح مطمئن تھے۔ سامان کی صُورت میں انسپکٹر جمشید کے
ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بریف کیس تھا۔ اور بس آدھ گھنٹے
تک چلتے رہنے کے بعد آبادی کے آثار شروع ہو گئے۔ شہری
حدود کے باہر ٹیلوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔

"فارُوق ہم اس ٹیلے کے پاس ملیں گے۔ تم کام دکھا
آؤ۔" انسپکٹر جمشید نے اچانک رُکتے ہوئے کہا۔

"آپ۔ آپ کا مطلب ہے۔ میں۔ میں اکیلا جاؤں۔"

"ہاں! ہم میں سے دو آدمیوں کا کسی کی نظروں میں آنے

سے یہ کہیں بہتر ہے کہ ایک آئے۔" انھوں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے۔ فاروق اگر تمہیں ڈر لگ رہا ہے تو میں جاتا ہوں۔" محمود جلدی سے بولا۔

"یہ بات نہیں ہے۔" اس نے ہنسا کر کہا اور پھر ان سے الگ ہو گیا۔

اب وہ ٹیلے کی طرف بڑھ رہے تھے اور فاروق آبادی کا رُخ کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ فاروق بظاہر سرسری انداز میں شہر کے لوگوں کو دیکھتا آگے بڑھ رہا تھا، لیکن حقیقت میں وہ بغور جائزہ لے رہا تھا۔ صاف ظاہر ہے۔ اسے کسی غریب آدمی کی نہیں۔ دولت مند کی جیب پر ہاتھ صاف کرنا تھا۔ جلد ہی وہ ایک کوٹھی کے سامنے سے گزرا۔ اسی وقت ایک بڑی کار کوٹھی سے نکلی اور فاروق اس کی زد میں آ گیا۔ لیکن کار والے نے مہارت سے بریک لگائے۔ ساتھ ہی کار والا چلّایا:

"اندھے ہو؟"

اس کی زبان، اس کا لہجہ، اس کے الفاظ سُن کر فاروق کو کوئی شک نہ رہا کہ وہ اس وقت بنگال کے دارالحکومت میں ہے۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

وہ یہاں کی زبان بول سکتا تھا، لیکن لہجے پر کنٹرول نہیں تھا۔ اور شاید اسی لیے انسپکٹر جمشید نے سیاحوں کے رُوپ میں آنا پسند کیا تھا؛ چناں چہ اس نے فوراً کہا:

"م۔ معاف کیجیے گا جناب۔ غلطی ہو گئی۔ لیکن آپ نے بھی تو کوٹھی سے باہر نکلتے وقت ہارن نہیں دیا۔"

وہ زور سے چونکا۔ چہرے پر شدید غصّے کے آثار نمودار ہو گئے۔ چند لمحے تک اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا، پھر چیخ کر بولا:

"ایک گرا پڑا سیاح۔ جو میرے مُلک میں ایک کیچوے سے بھی زیادہ حقیر ہے۔ مجھے آنکھیں دکھائے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" یہ کہتے ہی اس نے کار کا دروازہ کھولا۔ ایک جھٹکے سے باہر نکلا۔ فاروق کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور اس کی کلائی پکڑ کر کار کی طرف کھینچا۔ فاروق کار سے جا ٹکرایا، فوراً ہی اس نے پچھلا دروازہ کھول ڈالا اور اسے اندر دھکیل دیا۔ پھر خود کار میں بیٹھا اور کار چلا دی:

"میں تمہیں پولیس کے حوالے کروں گا۔ تم دس دن تک جیل میں رہو گے تو دماغ درست ہو جائے گا۔ اور پھر کبھی میرے مُلک کی سیاحت کا خیال تک دل میں نہیں لاؤ گے۔"

"لیکن میرا قصور کیا ہے جناب؟" فاروق نے مسکرا کر پوچھا
اس نے آئینے میں اسے مسکراتے دیکھ لیا۔ بس پھر
کیا تھا۔ کار کو ایک بار پھر بریک لگے:

"تت۔ تم۔ تم اور مسکرا رہے ہو؟"

"ہاں! اس لیے کہ مسکرانا میری عادت ہے۔" فاروق پھر
مسکرایا۔

"تب۔ پہلے میں تمہاری مسکراہٹ چھینوں گا، پھر پولیس
کے حوالے کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ پھر کار سے اترا اور پچھلا
دروازہ ایک جھٹکے سے کھولا۔ فاروق کو گریبان سے پکڑ
لیا اور لگا اسے جھنجوڑنے۔

"یہ۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں جناب؟" فاروق گھٹی گھٹی
آواز میں بولا۔

کار والے کی یہ حرکت دیکھنے کے لیے کچھ اور لوگ بھی
رک گئے اور لگے فاروق پر قہقہے لگانے۔

"یہ عقل سے پیدل سیاح۔ آخر ہمارے ملک میں کیوں
آ جاتے ہیں۔" کار والے نے جھلاتے ہوئے انداز میں کہا،
ایک آخری جھٹکا اسے دیا اور پھر سیٹ پر دھکا دے
کر، دروازہ بند کر دیا۔ اب وہ پھر کار میں بیٹھا اور
کار تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ فاروق نے تماشائیوں کا بلند

قہقہہ سنا۔

پولیس اسٹیشن کے پاس کار رک گئی۔ کار والا نیچے اترتے
ہوئے بولا:

"آؤ بچو۔ اب ذرا حوالات کی ہوا کھاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ پچھلے دروازے کی طرف مڑا اور پھر زور سے
اچھلا، اس کا شکار کار میں نہیں تھا۔

"ہائیں بچو۔ تم کہاں چلے گئے۔" یہ کہہ کر اس نے سیٹوں
کے درمیان میں اور یہاں تک کہ نیچے بھی دیکھا، جب کہ
کار کی سیٹوں کے نیچے کوئی ننھا سا بچہ بھی نہیں آ سکتا تھا۔

اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ دور بہت دور
اسے فاروق تیز تیز جاتا نظر آ گیا۔

"اوہ۔ وہ رہا بدمعاش۔" یہ کہہ کر وہ جلدی سے کار میں
بیٹھا اور اس کے پیچھے کار چھوڑ دی، لیکن اس وقت تک
فاروق ایک گلی میں گھس چکا تھا۔ اور ایک گلی سے دوسری
گلی میں۔ پھر وہ مڑتا ہی چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک سڑک
پر نکلا اور پھر چکرا کر رہ گیا، کیوں کہ اب اس کے فرشتوں
کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اس ٹیلے کو کون سا راستا جاتا
ہے۔ اب تو اس کی پریشانی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ آخر کچھ
سوچ کر ایک راہ گیر کی طرف بڑھا اور اس کے راستے

میں کھڑا ہو گیا:

"کیا بات ہے؟" راہ گیر کا لہجہ سخت تھا۔

"مم۔ میں سیاح ہوں۔ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا ہوں۔ آپ بتا سکتے ہیں۔ شہر کے بیرونی طرف جو ٹیلوں کا ایک سلسلہ ہے اس تک جانے کے لیے مجھے کون سا راستا اختیار کرنا ہوگا؟"

"تم تو مجھے کوئی پاگل لگتے ہو۔" اس نے اسے گھورا۔

"وہ۔ کیوں؟" اس نے گھبرا کر کہا۔

"ٹیلے تو شہر کے چاروں طرف ہیں۔ پہلے شہر کے اندر بھی تھے، اب ان کو ختم کر دیا گیا ہے۔"

"اوہ!" فاروق کے منہ سے نکلا اور راہ گیر بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اچانک فاروق کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔

صورتِ حال

کار والا اس جگہ پہنچ کر رک گیا، جہاں اس نے فاروق کو دیکھا تھا، لیکن اب فاروق کا دُور دُور پتا نہ تھا۔ وہ بھنا اُٹھا۔ سڑک کے کنارے کار روک کر سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور لائٹر نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دُوسرے ہی لمحے وہ زور سے اچھلا، اس کا رنگ اڑ گیا۔ اب اس نے کار کو موڑا اور تیز چلاتا پولیس اسٹیشن تک پہنچا۔

اندر بیٹھے انچارج نے اسے پریشان نظروں سے دیکھا اور بولا:

"کیا خدمت کر سکتے ہیں ہم۔ شاید آپ اپنا کوئی نقصان کر بیٹھے ہیں؟"

"آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ ایک سیاح لڑکا میرا بٹوہ اڑا لے گیا۔"

"کیا!" انچارج کے منہ سے نکلا، پھر اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا:

"سیاح لڑکا اور یہ جرأت۔ یہ تو آپ بہت عجیب خبر سُنا رہے ہیں۔"

"کیوں جناب۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا؟"

"ضرور ہو سکتا ہے، لیکن ذرا مشکل ہے۔ اس لیے کہ سیاح تو ہمارے مُلک میں بھیڑوں کی طرف خوف زدہ رہتے ہیں۔"

"ہاں! میں بھی یہی سمجھتا ہوں، اس لیے اس سیاح لڑکے کی جرأت پر مجھے غصہ آیا تھا۔"

"آپ کا مطلب چوری؟"

"نہیں۔ چوری سے پہلے بھی اس کے ساتھ کچھ ہوا ہے۔"

"اوہ! مہربانی فرما کر وضاحت کریں۔"

کار والے نے ساری کہانی کہہ سُنائی۔ انچارج کے ہونٹ دائرے کی صورت اختیار کر گئے، پھر اس نے کہا:

"مہربانی فرما کر اس لڑکے کا حلیہ لکھوا دیں۔ اپنی کوٹھی کا پتا بھی، کیوں کہ وہ آپ کو وہیں ملا تھا۔"

"جی ہاں! کیوں نہیں۔" اس نے کہا اور لکھوانے لگا۔

عین اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اُٹھا

کر کان سے لگا لیا۔ کار والے نے محسوس کیا، اس کی پیشانی پر لکیریں پڑتی جا رہی ہیں۔ پھر اس نے یس سر کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ چند لمحے تک وہ سوچ میں گم رہا، آخر کار والے سے بولا:

"آپ اس لڑکے کو دیکھیں تو پہچان لیں گے؟"

"فوراً۔ ایک سیکنڈ نہیں لگاؤں گا۔"

"میں آپ کو ایک تصویر دکھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور ایک الماری تک گیا، الماری میں سے ایک فائل نکال کر پھر اپنی کرسی پر آ بیٹھا اور فائل کے ورق اُلٹنے لگا۔ پھر فائل اس کی طرف کرتے ہوئے بولا:

"اس تصویر کو دیکھیے۔ کیا یہ اسی لڑکے کی ہے؟"

کار والے نے غور سے تصویر کو دیکھنا شروع کیا۔ تصویر مکمل تھی۔ آخر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا:

"نہیں جناب۔ یہ اس کی تصویر ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اس کا قد بھی اتنا نہیں تھا۔"

"اچھا! اس تصویر کو دیکھیں۔" اس نے ایک ورق اُلٹا۔

اب دوسری تصویر کار والے کے سامنے تھی۔ وہ چند سیکنڈ تک دیکھتا رہا، پھر اس نے کہا:

"اس لڑکے کا قد و قامت ضرور اتنا تھا، لیکن شکل صورت

بالکل مختلف ہے۔"

"ہوں ۔ خیر جناب ۔ ہم رپورٹ درج کر کے اس کی تلاش شروع کر دیتے ہیں ۔ جوں ہی وہ قابو آیا ، آپ کو زحمت دی جائے گی ، تاکہ آپ تصدیق کر سکیں ۔"

"ضرور کیوں نہیں ۔ میں فوراً حاضر ہوں گا ۔"

کار والا اُٹھا اور چلا گیا ، اس کے جاتے کے فوراً بعد انچارج نے گھنٹی بجائی ۔ فوراً ہی چپراسی اندر داخل ہوا :

"سب کو بلاؤ جلدی ۔ جلدی کرو ۔"

"او کے سر ۔" اس نے کہا ۔

تین منٹ کے اندر اس کے تمام ماتحت وہاں موجود تھے :

"چوری کی ایک رپورٹ درج کرائی گئی ہے ۔ میں اس طرف توجہ بھی نہ دیتا ۔ اور ہم عام حساب سے فوری طور پر چور کو گرفتار کر کے بٹوہ اس کے مالک کو واپس بھی دے دیتے ۔ لیکن ۔ ابھی ابھی مجھے ایک اہم اطلاع بھی دی گئی ہے اور وہ اطلاع ایسی نہیں کہ اسے نظر انداز کیا جائے ۔"

"لیکن وہ اطلاع کیا ہے سر ؟" اس کے اسسٹنٹ نے کہا ۔

"بتا رہا ہوں ۔"

اس نے کہا اور بتانے لگا ۔ سُننے والوں کی آنکھیں حیرت

ے پھیلتی چلی گئیں ۔

★

"اس کا مطلب ہے ۔ بیگم جمشید ہمیں دھوکا دے گئی ۔" شبانی بڑبڑایا ۔

"اور کیا کہا جا سکتا ہے ۔ لیکن خیر ۔ اب ہم بھی دروازہ اندر سے بند کر کے یہاں کی تلاشی لیتے ہیں ۔"

"لیکن روگو ۔ یہ بات تو انتہائی خطرناک ہو گی ۔ بیگم جمشید باہر جا کر کب خاموش بیٹھ جائے گی ۔ جلد ہی یہ مکان پولیس کے گھیرے میں ہو گا ۔"

"ہاں ! یہ ٹھیک ہے ۔ لیکن ہمیں اپنا کام جلد ہی سے پہلے کرنا ہے ۔"

"اچھی بات ہے ۔" اس نے کندھے اچکائے ۔

دونوں جلدی جلدی پورے گھر کو دیکھنے لگے ۔ صحن میں ان کی نظریں ایک پیڈ پر پڑیں ۔ پہلے تو انھوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی ، پھر روگو چونک اُٹھا :

"دیکھو شبانی ۔ پیڈ کے اس کاغذ سے اوپر والے کاغذ پر کچھ لکھا گیا ہے ۔ اس کے نشانات نچلے کاغذ پر بھی موجود

ہیں۔ ہم ان الفاظ کو ابھار سکتے ہیں۔"

"تو پھر اس پیڈ کے اوپر والے کاغذ کو لے لو اور
سے چلتے نظر آؤ۔ یہ گھر عام نہیں ہے۔ انسپکٹر جمشید کا ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر اس نے پیڈ کے اوپر والا کاغذ
اٹھا لیا۔ اب اسی راستے سے وہ گھر سے باہر نکلے، جس راستے
سے آئے تھے۔ اور اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ ان کے
جانے کے صرف تین منٹ بعد اکرام کی جیپ وہاں رکی۔
اس نے پہلے تو بیگم شیرازی کے دروازے پر دستک دی۔
پھر بیگم جمشید نے دروازے پر آ کر تفصیل اسے بتائی۔ اب
وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ گھر کی طرف مڑا۔ باہر سے دروازہ
کھول ڈالا۔ لیکن دروازہ تو اندر سے بھی بند تھا۔ اب وہ
اپنے ماتحتوں کے ذریعے چھت پر پہنچا۔ ایک ماتحت کو بھی
ساتھ لیا اور نیچے اترے، لیکن اندر کوئی نہیں تھا۔

چنانچہ بیرونی دروازہ کھول دیا گیا۔ بیگم جمشید اندر
گئیں۔ ساتھ میں بیگم شیرازی بھی تھیں۔ پورے گھر پر دیکھا
گیا، آخر بیگم جمشید نے کہا:

"ہر چیز موجود ہے۔ انھوں نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔"

"کسی چیز کو ہاتھ لگانے وہ آئے بھی نہیں تھے۔ ان کا
تو بس ایک ہی مقصد تھا۔ کسی طرح آپ سے یہ معلوم کر
کر انسپکٹر صاحب کہاں ہیں۔"

"اور یہ بات میرے فرشتوں سے بھی وہ معلوم نہیں کر
سکتے تھے، کیوں کہ مجھے معلوم ہی نہیں ہے۔" انھوں نے کہا۔

"یہ بہت اچھی بات ہے۔" اکرام نے خوش ہو کر کہا۔

ایسے میں بیگم شیرازی صحن کی میز کے پاس جا کھڑی
ہوئیں:

"یہ یہاں پیڈ کیسا رکھا ہے؟" وہ بولیں۔

"صدر صاحب نے انھیں کوئی حکم دیا تھا۔ اس حکم کے
سلسلے میں انھوں نے منہ سے کوئی بات نہیں بتائی تھی۔
تحریری بات کی تھی۔ اس سلسلے میں پیڈ کی ضرورت پڑی
تھی۔" بیگم جمشید نے بتایا۔

"اوہ!" اکرام نے چلا کر کہا، پھر وہ جلدی سے پیڈ
کی طرف آیا۔ چند لمحے تک اسے غور سے دیکھتا رہا۔ پیڈ
کے اوپر والے کاغذ پر بھی کسی حد تک حروف کے نشانات
موجود تھے۔

"لگ۔ کہیں وہ پیڈ کا اوپر والا کاغذ تو نہیں لے گئے۔"
اس نے گھبرا کر کہا۔

"اوہ!" بیگم جمشید کے منہ سے نکلا۔

دونوں کا رنگ اڑ گیا۔ بیگم شیرازی نے حیران ہو کر ان

کی طرف دیکھا اور بولیں:

"تو پھر - اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"اس سے یہ ہوتا ہے:" یہ کہہ کر اکرام نے ایک پنسل لی اور اس کے سیسے کو آہستہ آہستہ پیڈ کے کاغذ پر پھیرنے لگا - مدھم مدھم الفاظ اُبھرنے لگے - بیگم شیرازی کی حیرت کا کیا پوچھنا پھر اکرام نے ان الفاظ کو پڑھنے کی کوشش کی - اور کسی حد تک الفاظ پڑھ لیے - جن کا مطلب یہ تھا کہ صدر صاحب نے ہمارے ذمے ایک خفیہ مہم لگائی ہے - ہمیں بنگال جانا ہے

"تب تو وہ یہاں سے کامیاب لوٹے ہیں - اور میں یہ خیال کر رہی تھی کہ انھیں اُلّو بنانے میں کامیاب ہو گئی ہوں:"

بیگم جمشید نے بُرا سا منہ بنایا -

"یہ ضروری نہیں کہ وہ کاغذ لے ہی گئے ہوں، ہو سکتا ہے، اس طرف ان کا خیال تک نہ گیا ہو:" اکرام نے کہا -

"اللہ کرے، ایسا ہی ہو:" بیگم جمشید بولیں -

"آپ فکر نہ کریں - انسپکٹر صاحب، محمود، فاروق اور فرزانہ کوئی موم کی ناک نہیں ہیں:" اکرام نے کہا، پھر کچھ سوچ کر اس نے آئی جی صاحب کو فون کیا - اور یہ ساری بات بتائی -

وہ سُن کر سوچ میں ڈوب گئے، پھر بولے:

"اچھا! میں یہ اطلاع صدر صاحب کو دیتا ہوں:"

آئی جی صاحب نے صدر صاحب کے نمبر ملائے - اور سلسلہ ملنے پر بولے:

"انسپکٹر جمشید اور ان کے بچوں کو آپ نے کسی انتہائی خفیہ مہم پر بنگال روانہ فرمایا ہے:"

"ہاں شیخ صاحب - یہی بات ہے:"

"یہاں ایک واردات ہو گئی ہے - بہتر ہو گا کہ وہ آپ کے علم میں آ جائے:"

"کیسے:" انھوں نے کہا -

آئی جی صاحب نے تفصیل سُنا دی - صدر صاحب ساکت رہ گئے، پھر بولے:

"کچھ بھی ہو - اب ہم انھیں خبردار ہو جانے کی اطلاع دینے کے قابل بھی نہیں ہیں، کیوں کہ میں نے کوئی رابطہ نہ رکھنے کے لیے کہا تھا:"

"اوہ!" آئی جی کے منہ سے نکلا -

صورتِ حال بہت تشویش ناک ہو گئی تھی ---

دھماکا

"ہیلو شبانی۔ کیا رہا؟" روکن کی آواز گونجی۔
"کیا پوری تفصیل سناؤں باس؟"
"اگر اس میں زیادہ وقت برباد ہونے کا ڈر نہ ہو۔"
"جی ہاں! صرف دو یا تین منٹ لگیں گے۔"
"چلو خیر۔ میں سن لیتا ہوں۔" باس کی آواز سنائی دی۔
شبانی نے سارا قصہ کہہ سنایا۔ اس کے خاموش ہونے پر دوسری طرف سے روکن بولا:
"اور وہ کاغذ کہاں ہے؟"
"ہمارے پاس۔"
"تم نے اس کے الفاظ ابھارے ہیں؟"
"بالکل سر!"
"ٹھیک ہے۔ مجھے سناؤ۔ اور سنانے کے بعد اس کاغذ کو ضائع کر دینا۔"

"جی بہتر!" اس نے کہا اور کاغذ پر سے الفاظ پڑھنے لگا۔
س کے خاموش ہونے پر روکن نے کہا:
"شبانی۔ اور روگو۔ تم جانتے ہو۔ تم نے کتنا بڑا کام
ا ہے؟"
"ج۔ جی نہیں۔ ہمیں اندازہ نہیں ہے۔" شبانی نے کانپ
کہا۔
"یہ واقعی ایک کارنامہ انجام دیا ہے تم لوگوں نے۔
تمہاری سابقہ تنخواہ بحال کرتا ہوں۔" دوسری طرف سے کہا
۔
"بہت بہت شکریہ باس۔" اس نے فوراً کہا۔
"اور ہاں۔ تم دونوں کو آج ایک اور اعزاز مل رہا ہے۔"
س بولا۔
"جی۔ اعزاز۔ کیا مطلب؟" شبانی نے خوش ہو کر پوچھا۔
"ہاں! بہت بڑا اعزاز۔ جو میں نے آج تک کسی کو نہیں دیا،
تم دونوں نے کام ہی اتنا اہم کیا ہے۔ آج میں تم
ونوں کو اپنی شکل صورت دکھاؤں گا۔ تم میرے سامنے بیٹھ
جائے ہو گے۔"
"اوہ اوہ!" شبانی بولا۔
"کیوں، کیا ہوا؟" باس ہنسا۔

"گگ - کچھ نہیں - یہ واقعی ایک اہم اعزاز ہے۔"
"تو پھر تم مالک ہوٹل کے کمرہ نمبر چار سو تین میں آجاؤ۔
ابھی اور اسی وقت، لیکن خبردار کسی کو کچھ نہ بتانا۔"
"توبہ کیجیے سر" شبانی خوش ہو گیا - اور دوسری طرف سے
ریسیور رکھ دیا گیا -
انھوں نے فوراً ایک ٹیکسی پکڑی اور مالک ہوٹل کے سامنے
پہنچ گئے - اس کے کمرہ نمبر چار سو تین تک پہنچنے میں انھیں
کوئی دشواری نہ ہوئی - دھک دھک کرتے دل کے ساتھ روگو
نے دروازے پر دستک دی - فوراً ہی باس کی آواز ان کے
کانوں سے ٹکرائی:
"دروازہ کھلا ہے - آجاؤ۔"
انھوں نے دروازہ دھکیلا اور اندر داخل ہو گئے - ان
کے سامنے ان کا باس بیٹھا تھا، اسے بے نقاب دیکھ کر وہ
اچھل پڑے - آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں، کیوں کہ
عام زندگی میں وہ اس شخص کو ان گنت مرتبہ دیکھ چکے
تھے، لیکن عام زندگی میں اسے دیکھ کر کبھی خیال بھی نہیں
گزرا تھا کہ یہی شخص ان کا باس ہو گا۔
"آ - آ - آپ - آپ ہیں باس" شبانی بری طرح ہکلایا۔
"ہاں: کیا تم میری آواز نہیں پہچان رہے؟"

"ب ب - بالکل وہی آواز - یقیناً آپ ہی ہمارے باس ہیں۔"
"شکریہ - بیٹھو" اس نے کہا۔
دونوں بیٹھ گئے - باس بھی کرسی پر ان کے سامنے بیٹھا
رہا - آخر اس نے کہا:
"انسپکٹر جمشید کے گھر تم نے جو کارنامہ انجام دیا، اس کی
تفصیل ذرا ایک بار پھر مجھے سنا دو۔"
"او کے باس" شبانی بولا اور جلدی جلدی تفصیل سنانے لگا،
اس کے خاموش ہونے کے بعد باس بولا:
"کیا تم - میک اپ میں وہاں گئے تھے؟" باس بولا۔
"جی - جی نہیں۔"
"اور بیگم جمشید نے تم دونوں کو دیکھا بھی نہیں؟"
"جی نہیں - وہ تو پہلے ہی باہر چلی گئی تھی۔"
"لیکن اس نے تم سے بات ضرور کی تھی - بند دروازے
کی اوٹ سے - ٹھیک ہے نا؟"
"ہاں بالکل ٹھیک ہے۔"
"تم نہیں جانتے شبانی - روگو - وہ کس قدر چالاک عورت
ہے" باس نے مسکرا کر کہا۔
"جی - جی کیا مطلب؟"
"جب وہ دروازے کی اوٹ سے بات کر رہی تھی - تو -

اس نے تم دونوں کو دیکھا بھی تھا۔"

"نہیں باس ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"اس کے دروازے میں ایک خفیہ سوراخ ہے ۔ جس میں سے وہ ہر مُلاقاتی کو دیکھ سکتی ہے۔"

"اوہ ! اس بات کا ہمیں علم نہیں تھا۔" روگو نے پریشان ہو کر کہا۔

"یہ تو واقعی بُری بات ہو گئی۔" شبانی بولا۔

"ہاں ! بہت بُری سے بھی دو ہاتھ آگے ، کیوں کہ وہ تمہیں دیکھ چکی ہے ۔ اب وہ انسپکٹر جمشید کے ماتحت کو تم دونوں کے حلیے بتا دے گی ۔ انسپکٹر جمشید کا ماتحت سب انسپکٹر اکرام، تم شاید نہیں جانتے ۔ اس معاملے میں شیطانی ذہن رکھتا ہے۔"

"جی ۔ کیا مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ پولیس کے ریکارڈ میں جن جرائم پیشہ لوگوں کی تصاویر موجود ہیں ۔ ان میں سے کسی کا حُلیہ اگر اسے بتایا جائے تو وہ فوراً ریکارڈ میں سے اس کی تصویر نکال لیتا ہے۔"

"اوہ ۔ اوہ ۔"

"اور جب اسے معلوم ہو جائے گا کہ اس کے افسر کے گھر میں داخل ہونے کون لوگ تھے تو پھر وہ تم تک پہنچ جائے گا۔"

"اوہ ۔ لیکن پھر کیا ہوا باس ۔ ہم اس سے نبٹ لیں گے ۔ ہم اسے ٹھکانے لگا دیں گے ، آپ فکر نہ کریں۔" روگو نے جلدی جلدی کہا۔

"میں فکر کس طرح نہ کروں روگو ۔ فرض کرو ۔ تم دونوں اسے ٹھکانے نہ لگا سکے ۔ پھر کیا بنے گا ۔ وہ تم دونوں کو کمرۂ امتحان میں لے جائے گا ۔ یہ کمرۂ امتحان انسپکٹر جمشید نے ترتیب دیا ہے ۔ اس میں لے جائے جانے والے مُجرم فر فر بولنے لگتے ہیں ۔ لہٰذا تم بھی وہاں فر فر بول اُٹھو گے ۔ اور اب چُوں کہ تم نے مجھے دیکھ لیا ہے ۔ لہٰذا تم دونوں میرا نام اسے بتا دو گے ۔ میں کوئی ڈھکا چھپا آدمی نہیں ہوں ۔ فوراً گرفتار کر لیا جاؤں گا۔"

"نن ۔ نہیں۔" روگو کانپ گیا ۔ شبانی کا بھی رنگ اڑ گیا ۔ اب وہ باس کا مطلب سمجھ گئے تھے ۔

"نہیں بھئی ۔ تم دونوں کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ۔ میں تمہیں ہلاک کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا ۔ تم نے میرے لیے کئی کام انجام دیے ہیں ۔ اور بھی نہ جانے کتنے کام لوں گا ۔ میری ایک تجویز ہے ۔ تم چند ماہ کے لیے غائب ہو جاؤ ۔ اس شہر سے نکل جاؤ ۔ گھومو پھرو ۔ عیش کرو ۔ تمام اخراجات میرے ذمے ہوں گے ۔ میں اسی وقت تم دونوں کو تیس ہزار

روپے دے رہا ہوں۔ میری ایک فالتو کار بھی لے جاؤ۔
بس تین ماہ تک مجھ سے ہرگز کوئی رابطہ نہ رکھنا۔ تیس ہزار
کم پڑتے نظر آئیں تو کار نہ بیچ دینا۔"

"یہ۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں باس۔" روگو نے اطمینان کا
سانس لے کر کہا۔

"اس کے سوا اور کوئی ترکیب نہیں۔ اگر ہو تو تم بتا دو۔"
اس نے کہا۔

"ہم۔ ہم تیار ہیں باس۔"

"شکریہ!"

یہ کہ کر باس اُٹھا۔ کمرے کی دیوار میں نصب ایک الماری
کا دروازہ کھولا۔ اس میں سے نوٹوں کے تین پیکٹ نکالے،
ایسے میں جو وہ ایک طرف کو ہٹا تو دونوں کی نظریں الماری
میں جا پڑیں۔ ان کی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ الماری سُرخ نوٹوں
کی گڈیوں سے بھری ہوئی تھی۔

"یہ لو بھئی۔ اور یہ رہی کار کی چابی۔ سفید کار ہے۔"

"شش۔ شکریہ باس۔"

نوٹوں کی گڈیاں اور چابی اُٹھا کر وہ کرسیوں سے اُٹھے،
باس کو سلام کیا اور کمرے سے نکل گئے۔ ان کے باہر
نکلتے ہی کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔

دونوں نیچے کھڑی سفید کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو
گئے۔

روگو۔ تم نے دیکھا۔ باس کی الماری نوٹوں کے پیکٹوں
سے بھری ہوئی ہے۔"

ہاں۔ تو پھر۔" روگو نے ایسے انداز میں کہا جیسے نشے میں ہو۔
گ۔ کیوں نہ۔ کل رات ہم اس الماری پر ہاتھ صاف
کر دیں۔"

کیا کہا۔ الماری پر ہاتھ صاف۔ اور وہ بھی باس کی۔"
وہ چلایا۔

ہاں! ہم رات کو ہی شہر میں داخل ہوں گے اور یہ
کام کر کے شہر سے نکل جائیں گے اور پھر تین ماہ کیا ساری
عمر باس کو اپنی شکل نہیں دکھائیں گے۔"

بھئی سوچ لو۔ کام بہت خطرناک ہے۔ اتنا کر جان
جانے کا بھی خطرہ ہے۔"

یہ بھی تو دیکھو۔ کہ الماری بالکل لبریز ہے۔"

خیر۔ ابھی ہمارے پاس وقت ہے۔ سوچ لیتے ہیں۔"

ویسے میرا خیال ہے۔ باس بلا وجہ ہی ڈر گیا ہے۔
ہمارے لیے شہر میں خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ہم یہاں دس
سال پہلے وارداتیں کیا کرتے تھے۔ دس سال پہلے کا ریکارڈ

کیا انسپکٹر جمشید کے ماتحت کے ذہن میں ہوگا۔"

"ہو نہ ہو۔ ہمیں یہاں رہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ...
ہزار روپے اور ایک کار۔ عیش کرنے کے لیے یہ دونوں چیز...
تین ماہ کے لیے بہت کافی ہیں۔"

"چلو۔ جیسے تمھاری مرضی۔ وہ الماری بار بار میری آنکھوں
کے سامنے گھوم رہی ہے۔"

"آنکھیں بند نہ کر لینا۔ ورنہ کار۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک زبردست دھماکا ہوا...
کار کے پرخچے اڑ گئے۔

اندھے ہو گیا

انسپکٹر جمشید نے پریشان ہو کر کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھا:
"نہیں بھی۔ وہ اتنی دیر نہیں لگا سکتا تھا۔ وہ ضرور کہیں
پھنس گیا ہے۔ اور اس کا پھنسنا ہم تینوں کے لیے بھی خطرناک
ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ہمیں یہاں سے کھسک لینا چاہیے۔"

"لیکن ابّا جان۔ اگر ہمارے یہاں سے جانے کے بعد فاروق
یہاں پہنچا۔ تو کس قدر پریشان ہوگا۔" فرزانہ بولی۔

"ہاں! یہ بات بھی ہے۔ لیکن صدرِ مملکت نے جو کام
ہمیں سونپا ہے۔ وہ فاروق سے زیادہ اہم ہے۔ اور فاروق
کی خاطر اس کام کو کھٹائی میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ آؤ چلیں۔"
انھوں نے کہا۔

محمود اور فرزانہ کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ فاروق کے
بغیر وہاں سے جائیں، لیکن کر ہی کیا سکتے تھے۔ بریف کیس
کو ریت میں دبا کر وہاں سے چل پڑے؛ تاہم مڑ مڑ کر

ٹیلے کی طرف دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ ٹیلہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"فاروق کا خیال ذہن سے نکال دو۔ ورنہ تم کوئی کام نہیں کر سکو گے۔ اور اس ٹیلے کو پہچاننے کے لیے کچھ نشانیاں ذہن میں رکھ لینا۔ رہائش وغیرہ کا بندوبست کر کے ہم بریف کیس نکال لے جائیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ج ۔ جی بہتر!"

"اور اب فاروق والا کام تم کرو گے محمود۔ نقدی کے بغیر یہاں کام نہیں چلے گا۔ لہٰذا تم جاؤ اور کسی مال دار آدمی کی جیب پر ہاتھ صاف کر لاؤ۔ اب ہم یہاں رکیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"بہت بہتر ابا جان" محمود بولا اور وہاں سے آگے بڑھا۔

وہ دائیں بائیں بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ اس خیال سے کہ شاید کہیں فاروق نظر آ جائے، حالاں کہ اس کے والد ہدایت دے چکے تھے کہ فاروق کا خیال ذہن سے نکال دو۔ لیکن وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

ایسے میں اس کی نظر ایک موٹے آدمی پر پڑی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھا۔ بیگ کافی پھولا ہوا تھا۔ اور اس نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ محمود نے

سوچا۔ شاید اس بیگ میں کوئی لمبی رقم ہے۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اور اندھا دھند انداز میں ٹکرا گیا۔

دونوں دھڑام سے گرے۔

"ارے ارے۔ اندھے ہو گیا؟" بیگ والا چلّایا۔

"ج ۔ جی ۔ وہ ۔ میں اندھا نہیں۔ سیاح ہوں۔ سیاح۔" محمود ہکلایا۔

"سیاح لوگوں سے ٹکراتے پھرتے ہیں کیا؟" اس نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ارے! یہ آپ کے بیگ کی زپ کھل گئی۔ ارے ارے، اپنی نوٹوں کی گڈیاں سنبھالیے۔" محمود نے گھبرا کر کہا۔

"اُف۔ میرے نوٹ ۔ تم ۔ تم شیطان۔" اس نے کہنا چاہا۔ لیکن پھر جلدی جلدی نوٹوں کے پیکٹ اٹھا کر بیگ میں ٹھونسنے لگا۔

"ہم ۔ میں مدد کروں جناب۔" محمود نے دل میں مسکرا کر کہا۔

"خبردار۔ ہاتھ بھی نہ لگانا۔"

"جی۔ جی بہتر!" وہ سہم گیا۔

"کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

"بہت اچھا جناب" محمود نے کہا، تیزی سے مڑا اور اس سمت میں چل پڑا۔ جس جگہ اپنے والد اور فرزانہ کو چھوڑ کر

آیا تھا۔

اسے ان تک پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔

"کیا رہا محمود؟"

"نوٹوں کا ایک پورا پیکٹ میری جیب میں ہے۔"

"وہ مجھے دے دو۔ بلکہ اس میں سے چند نوٹ تم اور فرزانہ بھی لے لے۔"

"کیوں! اس کی کیا ضرورت ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔ ہم بھی آپس میں بچھڑ جائیں۔ اس صورت میں کچھ نقدی تو جیب میں ہو گی۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔" محمود نے کہا اور پھر ایسا ہی کیا۔

اب انھوں نے شہر کا رُخ کیا۔ اطمینان سے چلتے ہوئے وہ ایک درمیانے درجے کے ہوٹل کے سامنے پہنچ گئے۔

"میرا خیال ہے۔ رہائش کے لیے یہ مناسب رہے گا۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"ہاں بالکل ٹھیک ہے۔"

ہوٹل میں کمرہ حاصل کرنے میں انھیں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ کمرے میں پہنچ کر، دروازہ اندر سے بند کر کے انھوں نے اطمینان کا سانس لیا، لیکن فوراً ہی انھیں فاروق کا خیال آ گیا۔ ان کے چہرے تن گئے۔

"نہ جانے فاروق کہاں ہے؟" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

عین اسی وقت کمرے کے دروازے پر دستک دی گئی۔

★

بیگ والا اپنے بنک میں داخل ہوا۔ سلپ اور نقدی اس نے کیشیر کے سامنے رکھ دی۔ کیشیر نقدی گننے لگا، پھر اس نے کہا:

"سلپ آپ نے ایک لاکھ پچاس ہزار کی بھری ہے۔ اور یہ ایک لاکھ چالیس ہزار۔"

"کیا کہا۔" بیگ والا چلّایا۔

"جی ہاں! پورے دس ہزار کم۔ یعنی ایک پیکٹ۔"

"نن۔ نہیں۔" وہ بولا۔

"نن۔ نہیں کیا۔ آپ خود چیک کر لیں۔"

"یہ نن نہیں۔ میں نے آپ سے نہیں کہا۔ راستے میں ایک سیاح لڑکا مجھ سے ٹکرایا تھا۔ یہ شرارت ضرور اس کی ہے۔ وہ ضرور اسی لیے مجھ سے ٹکرایا تھا۔"

"اوہ۔ تب تو آپ کو فوری طور پر پولیس اسٹیشن جانا چاہیے۔"

"ہاں ضرور۔" اس نے کہا اور اپنی نقدی سمیٹ کر پھر

بیگ میں ڈالی اور باہر نکل آیا۔ جلد ہی وہ ایک پولیس اسٹیشن
میں داخل ہو رہا تھا۔

پولیس انسپکٹر اس کی کہانی سُن کر چونکا، پھر اس نے
جلدی جلدی ایک فائل نکالی۔ اس میں چار تصاویر تھیں۔
پولیس انسپکٹر بولا:

"ان دونوں میں سے وہ کون سا تھا؟"

"ان۔ ان میں سے تو کوئی بھی نہیں تھا۔"

"شکل صورت پر نہ جائیں۔ وہ میک اپ میں رہا ہو گا۔
آپ صرف قد اور قامت دیکھیں۔"

"اوہ ہاں۔ قد اور قامت بالکل اس جیسا تھا۔" اس نے
ایک تصویر پر اُنگلی رکھ دی۔

"شکریہ!" پولیس انسپکٹر پُرجوش لہجے میں بولا اور پھر
وائرلیس پر یہ واقعہ دہرانے لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر
وہ بیگ والے کی طرف مُڑا:

"گھر سے چلتے وقت آپ نے نوٹوں کے نمبر تو لکھ لیے
تھے نا؟"

"جی نہیں۔ میں نے ایسا نہیں کیا تھا۔"

"خیر۔ آپ اس لڑکے کو پہچان تو لیں گے نا؟"

"ضرور۔ فوراً پہچان لوں گا۔"

شکریہ۔ جوں ہی ہمارا پیغام آپ کو ملے۔ چلے آئیے گا۔"

"بہت بہتر۔ میرے دس ہزار کا کیا بنے گا؟"

"وہ آپ کو مل جائیں گے۔ فکر کی ضرورت نہیں۔"

"شکریہ انسپکٹر۔" بیگ والا یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

★

فاروق نے ایک گزرتی ٹیکسی روکی۔ جوں ہی وہ رُکی۔
دروازہ کھول کر اس میں بیٹھتے ہوئے بولا:

"جناب! میں ایک سیاح ہوں۔ کیا آپ مجھے شہر کے بیرونی
حصوں کی سیر کرا دیں گے۔ بس میں ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے ایک
چکر لگاؤں گا۔"

"ضرور کیوں نہیں۔" ڈرائیور نے کہا اور ٹیکسی چل پڑی۔
جلد ہی وہ شہر کے بیرونی حصے کی طرف آ گئے۔ فاروق
کو ٹیلے نظر آنے لگے۔ وہ نظر آنے والے ہر ٹیلے کو آنکھیں
پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ لیکن اسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ
اسے کون سے ٹیلے کی طرف جانا ہے۔ یہاں تک کہ سارے
شہر کا چکر پورا ہو گیا۔ یہ بات اسے ڈرائیور کی زبانی معلوم
ہوئی۔ اس نے کہا:

"ہاں جناب! اب کہاں چلوں۔ سارے شہر کا چکر تو ہو گیا پورا۔"

"پہلے ذرا مجھے پیشاب کر لینے دیں۔"

"اچھی بات ہے۔" ڈرائیور نے ٹیکسی روک دی۔

فاروق اُتر کر ایک ٹیلے کے پیچھے چلا گیا۔ جب کافی دیر گزر گئی اور ڈرائیور کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اس نے ہانک لگائی:

"اور کتنی دیر لگائیں گے جناب؟"

فاروق دم سادھے بیٹھا رہا۔

"ارے۔ کہیں آپ بے ہوش تو نہیں ہو گئے۔ کسی سانپ کا شکار تو نہیں ہو گئے۔ میں تو بتانا ہی بھول گیا۔ ان اطراف میں سانپ بہت ہیں۔ وہ بھی زہریلے قسم کے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی، فاروق چت لیٹ چکا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ڈرائیور ٹیلے کے دوسری طرف جا کر بولا:

"ارے۔ وہی ہوا۔ جس کا ڈر تھا۔" یہ کہتے ہوئے وہ بے تحاشہ اس پر جھکا۔ فوراً ہی اس کی دونوں آنکھوں میں ریت گری:

"یہ۔ یہ کیا ہے۔" اس کے منہ سے گھبرائی ہوئی آواز نکلی۔

دونوں ہاتھ آنکھوں پر جم گئے۔ اسی وقت اس کی کمر پر ایک زوردار دوہتھڑ لگا۔ وہ دھب سے اوندھے منہ گرا۔ ایک اور ٹھوکر اس کے سر پر لگی۔ ساتھ ہی فاروق نے کہا:

"معاف کرنا۔ تمہاری ٹیکسی تھوڑی سی دیر کے لیے لے جا رہا ہوں۔ شہر کی کسی سڑک پر مل جائے گی۔"

جلدی جلدی یہ الفاظ کہہ کر اس نے ڈرائیور کی تلاشی لی، نقدی جیب میں ڈالی، پھر ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں سے نکل بھاگا۔ کچھ ہی دور جا کر اس نے ٹیکسی چھوڑ دی، کیوں کہ شہر میں اس کا ٹیکسی چلانا فوراً بھانپ لیا جاتا۔ اب وہ پیدل چل رہا تھا اور یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اس کے والد، محمود اور فرزانہ نہ جانے کہاں ہوں گے۔

اچانک اس کے پاس سے پولیس کی چند گاڑیاں بہت تیزی سے گزر گئیں۔ اس کے ذہن میں سوال گونجا:

"کیا یہ گاڑیاں ہماری تلاش میں ہیں۔ کیا ان لوگوں کو ہمارے بارے میں معلوم ہو چکا ہے؟"

سب سے پہلے اسے کسی ٹھکانے کی ضرورت تھی۔ سڑکوں پر چل چل کر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ آخر ایک ہوٹل پر اس کی نظر پڑی۔ وہ اس میں داخل ہو گیا:

"مجھے ایک کمرہ چاہیے۔" اس نے کاؤنٹر پر پہنچ کر کہا۔

"مل جائے گا جناب۔ تین دن کا کرایہ جمع کرانا ہوگا۔"

"اور تین دن کا کرایہ کتنا؟"

"ڈیڑھ سو روپے۔" اس نے کہا۔

فاروق نے جیب میں سے کار والے کا بٹوہ نکالنے کی بجائے ٹیکسی ڈرائیور سے حاصل کیے گئے نوٹ نکالے اور ڈیڑھ سو گن دیے۔ کلرک نے حیران ہو کر اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا، کیوں کہ کرنسی نوٹ بے ترتیبی کے عالم میں تھے، فاروق کو بھی اس بات کا خیال اسی وقت آیا۔ اس نے جلدی سے ڈیڑھ سو روپے کے نوٹ کاؤنٹر پر رکھے اور بقیہ جیب میں ڈال لیے، پھر اس نے کہا:

"ہم سیاح بھی کیا بے ترتیب زندگی گزارتے ہیں۔"

"ہاں۔ واقعی۔" کلرک بولا، پھر اس نے ایک رجسٹر اس کے سامنے کر دیا:

"اس میں اپنا نام وغیرہ لکھ دیں۔ دستخط کر دیں۔"

فاروق لکھنے لگا، پھر کمرے کی چابی لے کر وہ اوپر آ گیا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا، سب سے پہلے کرنسی نوٹ ترتیب سے لگا کر جیب میں رکھے اور پھر بستر پر نیم دراز ہو کر سوچ میں گم ہو گیا۔ ایسے میں اسے کمرے کی کھڑکی کھولنے کا خیال آیا، کیوں کہ دروازہ بند ہو

جانے کی صورت میں حبس سا ہو گیا تھا۔ کھڑکی کھولتے ہوئے اس نے نیچے جھانکا اور پھر ساکت ہو گیا۔

پولیس کی کئی گاڑیاں ہوٹل کے سامنے آ کر رکی تھیں، پھر پولیس والے آن کی آن میں ہوٹل کو چاروں طرف سے گھیرے میں لینے لگے۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

اچانک اس نے محسوس کیا۔ پولیس اس کے لیے آئی ہے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ وہ فوراً کمرے سے نکلا۔ نیچے جانے کا تو اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ لہٰذا فوراً اوپر کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ ہوٹل گیارہ منزلہ تھا۔ ایک کمرے کا کھلا دروازہ دیکھ کر بے دھڑک اس میں گھس گیا۔ اندر ایک صاحب سو رہے تھے۔ فاروق نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور چٹخنی لگا دی۔ سوئے ہوئے آدمی پر نظر ڈالی اور کھڑکی پر جھک گیا، پولیس چاروں طرف موجود تھی۔ اور شاید اندر بھی داخل ہو چکی تھی۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ کسی اور سلسلے میں آئی ہو۔" اس نے دل میں کہا۔

لیکن فوراً ہی اس کی نفی ہو گئی۔ ہوٹل کے باہر سپیکر پر اسی وقت ایک آواز ابھری:

"کمرہ نمبر ۵۰۳ کا مسافر نیچے اتر آئے۔ پولیس اس سے چند

سوالات کرنا چاہتی ہے۔ ابھی تک معاملہ صرف معمولی سی پوچھ گچھ کا ہے، لیکن اگر اس نے فرار ہونے یا کہیں چھپنے کی کوشش کی تو پھر اسے گرفتار کیا جائے گا اور سختی بھی کی جائے گی۔"

یہ اعلان تین بار دہرایا گیا اور آخری بار یہ اضافہ کیا گیا:

"صرف دس منٹ تک انتظار کیا جائے گا۔ اس کے بعد ہوٹل کی تلاشی شروع کر دی جائے گی۔"

فاروق نے کھڑکی بند کر دی۔ کمرہ نمبر ۵۰۳ اسی کو دیا گیا تھا۔ پولیس صرف اور صرف اس کے لیے آئی تھی۔

عین اسی وقت سوتے مسافر کی آنکھیں کھل گئیں۔۔۔

لی مورا

انھوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا:

"کوئی پروا نہیں۔ دروازہ کھول دو۔" انسپکٹر جمشید دبی آواز میں بولے۔

محمود اٹھ کر دروازے تک گیا۔ چٹخنی گرا دی۔ باہر ایک لمبے قد کا آدمی کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے:

"آپ نے یہاں آکر غلطی کی۔ کسی پرائیویٹ جگہ رہائش اختیار کرتے تو بہتر تھا۔" اس نے دبی آواز میں کہا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو دوست؟" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

"وقت بہت نازک ہے۔ آپ پچھلے دروازے سے نکل کر ہوٹل سے دور ہو جائیں۔ جس قدر جلد ممکن ہو۔"

"لیکن کیوں۔ ہم ایسا کیوں کریں؟"

"اوہ! آپ اس طرح نہیں سمجھیں گے۔ خیر سن لیں۔۔۔

یہاں اُلّو بہت ہیں۔"

"اوہ!" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا، پھر وہ تیزی سے اُٹھے اور بولے:

"آؤ چلیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی ابا جان۔" فرزانہ گھبرا گئی۔

"یہ ہمارے ساتھی ہیں۔ بس۔" انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے۔

وہ افراتفری کے عالم میں کمرے میں نکلے، لیکن ٹھٹک کر رہ گئے۔ دوسری طرف سے ایک پولیس آفیسر اپنے آٹھ نو ماتحتوں کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید نے محسوس کیا۔ وہ پُر اسرار آدمی دوسری طرف منہ اُٹھائے پُرسکون انداز میں چلا جا رہا تھا۔ اور اس کی یہ چال کارگر رہی۔ پولیس نے اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ہاں ان پر ضرور ان کی نظریں جمی تھیں:

"کیا فرار کی تیاریاں ہو رہی تھیں؟"

"فرار کیسا؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"شاید تم لوگوں کو خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔"

"پتا نہیں۔ آپ کیا کہ رہے ہیں۔"

"آپ لوگوں کو ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔"

"ہمارا قصور؟" وہ بولے۔

"قصور ایک نہیں۔ بہت سے ہیں۔ جن کی تفصیل ہم یہاں نہیں۔ وہیں چل کر بتائیں گے۔"

"ہمیں ایک بار اپنے کمرے میں جانے کی اجازت ہے یا نہیں؟"

"ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔"

تینوں مڑے اور کمرے میں داخل ہو گئے۔ ان کے پیچھے ہی پولیس والے داخل ہوئے۔ اچانک انسپکٹر جمشید تیزی سے پلٹے اور انسپکٹر سے ٹکرا گئے۔ ان کا سر اس کی ناک پر اس زور سے لگا کہ وہ فوری طور پر گر پڑا۔ ناک سے خون جاری ہوتا نظر آیا۔ یہ سب ایک لمحے میں ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ اس کے ساتھی اپنی حیرت پر قابو پاتے اور ان کے خلاف کوئی قدم اُٹھاتے۔ وہ ان پر ٹوٹ پڑے۔ محمود نے پہلا کام یہ کیا کہ تیر کی طرح دروازے پر گیا اور اس کو بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ اس وقت تک فرزانہ ایک پولیس والے کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ چکی تھی، وہ دھڑام سے گرا، اسی وقت محمود دروازہ بند کر کے مڑا، اس نے پاؤں کی ایک ٹھوکر گرنے والے کی پسلیوں میں دے ماری۔ اور پھر دوسری ٹھوکر اس کے سر میں لگی۔

دونوں آگے بڑھے۔ عین اسی وقت انسپکٹر جمشید کا ایک بھرپور
مکا کھا کر ایک پولیس والا اچھلا اور ان پر گرا۔ دونوں
اس کے ساتھ پیچھے گرتے چلے گئے۔ پھر جھٹکا کر اسے
اپنے اوپر سے اچھال پھینکا۔ اس کا جسم اپنے ہی ایک ساتھی
سے ٹکرا گیا۔ دونوں نے پھرتی دکھائی اور ان پر تابڑ توڑ
لاتیں اور مکے برسا دیے۔

دوسری طرف انسپکٹر جمشید کے ہاتھ اور پیر بھی بجلی کی
طرح کوند رہے تھے۔ چند منٹ میں ہی میدان صاف تھا،
اسی وقت باہر سے آواز آئی:

"اب بس کیجیے۔ جلدی سے باہر نکل آئیے۔"

وہ سمجھ گئے۔ یہ ان کے اسی ساتھی کی آواز تھی۔
پُر اسرار ساتھی کی۔ دروازہ کھولتے ہی وہ باہر آ گئے:

"میرے ساتھ آ جائیں۔ اب فرار ہونے کا وقت گزر
چکا ہے اور پولیس پہنچ چکی ہے۔" اس نے کہا۔

وہ انھیں نچلی منزل کے ایک کمرے میں لے آیا۔
دروازہ اندر سے بند کر کے انھیں ایسی جگہ بٹھایا کہ تالے
کے سوراخ میں سے بھی انھیں دیکھا نہ جا سکے:

"یہاں آپ صرف چند منٹ کے لیے محفوظ ہیں۔" اس نے
بیٹھنے کے بعد کہا۔

"اور پھر۔ چند منٹ بعد؟"

"خود کو پولیس کے حوالے کرنا ہوگا۔"

"تب پھر آپ ہمیں یہاں کیوں لائے ہیں؟"

"وہاں یہ چند منٹ بھی نہ ملتے۔"

"ان چند منٹوں کا آخر فائدہ کیا ہے؟"

"ہم ان چند منٹوں میں چند باتیں تو کر ہی سکتے ہیں۔
پتا نہیں انھوں نے یہ کس طرح معلوم کر لیا کہ آپ لوگ
یہاں داخل ہو گئے ہیں، بہرحال اس اطلاع کے ملتے ہی
انھوں نے ہوٹلوں کو خبردار کیا کہ جوں ہی کوئی سیاح ہوٹل
میں آ کر ٹھہرے، انھیں اطلاع دی جائے، اس طرح یہ لوگ
آپ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔"

"وہ تو خیر ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کی یہاں موجودگی ہماری
سمجھ میں نہیں آئی۔"

"میں اسی ہوٹل میں رہتا ہوں۔ بلکہ اسی ہوٹل میں ملازمت
کر کے اپنا پیٹ پالتا ہوں۔ اور ساتھ میں اپنا اصل کام بھی
کرتا ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"سوال یہ ہے کہ آپ نے ہمیں کس طرح پہچان لیا؟
ہمارا تو خیال ہے کہ اس میک اپ میں ہمیں کوئی نہیں پہچان
سکتا۔"

"میں نے شکل صورت سے نہیں پہچانا۔ شہر میں جو خبریں پھیلی ہوئی ہیں، ان کو سامنے رکھ کر آپ لوگوں کی حرکات اور سکنات کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا۔"

"لیکن ہمیں آپ کا کیا فائدہ۔ آپ تو ہمیں یہ خبر سنا رہے ہیں کہ ہمیں خود کو پولیس کے حوالے کرنا پڑے گا۔"

"ہاں! اس لیے کہ ہوٹل پوری طرح پولیس کی نگرانی میں ہے۔ میں نے اگر آپ لوگوں کو بچانے کی کوشش کی تو پھر میں بھی نہیں بچوں گا۔"

"لیکن ہمیں یہاں لانے کے جرم میں بھی تو آپ پکڑے جا سکتے ہیں۔"

"نہیں۔ یہ میرا کمرہ ہے۔ اور آپ لوگ یہاں زبردستی گھس آئے تھے۔ بلکہ میرا پستول نکال کر مجھ پر تان دیا تھا۔ میں کیا کر سکتا تھا۔ یہ لیجیے۔ میرا پستول اپنے قبضے میں کر لیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا پستول نکالا اور انسپکٹر جمشید کی طرف اچھال دیا۔

"اچھی ترکیب ہے، لیکن ہم چاہتے ہیں۔ پولیس کے ہاتھ نہ لگیں۔ اس طرح ہمارے کام میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔"

"آپ کے چوتھے ساتھی نظر نہیں آ رہے ہیں۔"

"شہر میں کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہے۔" وہ مسکرائے۔

"اوہ۔ کیا وہ آپ سے بچھڑ گئے ہیں؟"

"ہاں!" انسپکٹر جمشید بولے۔

ایسے میں فرزانہ اٹھی اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ اس نے پہلے کھڑکی میں سے نیچے جھانکا، پھر غسل خانے کو دیکھا اور پھر واپس ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی:

"پولیس سے بچنے کا کوئی راستا نہیں ہے۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"اگر ہوتا تو میں پہلے ہی نہ بتا دیتا۔ قدموں کی آوازیں گونجنے لگی ہیں۔ اب آپ لوگ گرفتاری کے لیے تیار ہو جائیں۔" اس نے کہا۔

انسپکٹر جمشید نے جلدی سے پستول اس کی طرف تان دیا، بھاری قدموں کی آواز دروازے پر آ کر رک گئی۔ اور پھر دستک دی گئی۔ تینوں دیوار سے چپک کر کھڑے ہو گئے اور اپنے ساتھی کو اشارہ کیا کہ اٹھ کر دروازہ کھول دے۔

اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

"ہمیں چند مجرموں کی تلاش ہے۔"

"اندر آ کر دیکھ لیں۔" اس نے کہا۔

"اوہ۔ تو وہ یہاں بھی نہیں ہیں۔ خیر۔ اگر وہ یہاں پناہ لینے کی کوشش کریں تو آپ فوراً کاؤنٹر پر اطلاع دیں۔"

"بہت بہتر!" اُس نے کہا۔

پولیس والے دروازے پر سے ہی لوٹ گئے۔ وہ حیران رہ گئے۔ قدموں کی آواز دُور جانے پر محمود بولا:

"یہ ۔ یہ کیا ہوا؟"

"مجھے خود حیرت ہے۔ پولیس اندر کی تلاشی لیے بغیر نہیں جا سکتی تھی۔ اس میں ضرور کوئی چال ہے۔" ان کے ساتھی نے کانپ کر کہا۔

"کیا مطلب۔ آپ کیوں سہم گئے؟"

"پولیس کا خیال ہے کہ یہاں آپ لوگوں کا کوئی ہمدرد ضرور ہے۔ دراصل وہ اس کی تلاش میں ہیں۔"

"تب پھر آپ خود کو خطرے میں نہ ڈالیں اور کاؤنٹر پر فون کر دیں اور یہ پستول اب اپنے ہاتھ میں لے کر اسے ہماری طرف تان دیں۔" انسپکٹر جمشید نے تجویز پیش کی۔

"ہاں! اب یہی کرنا ہوگا۔" وہ بڑبڑایا۔

"یہاں آپ کا نام کیا ہے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"میں لی مورا کہلاتا ہوں۔ خود کو یہودی ظاہر کر کے رہتا ہوں۔"

"اور نماز روزے کا کیا کرتے ہیں؟"

"نمازیں اپنے کمرے میں ادا کرتا ہوں اور اسی طرح روزے بھی رکھتا ہوں۔"

"شکریہ۔ اب آپ پولیس کو اطلاع۔ ارے نہیں۔ اس طرح ہی پولیس آپ پر شک کرے گی۔ کیوں نہ ہم آپ کے کمرے سے نکل جائیں۔ آخر پولیس ہمیں آپ کے کمرے سے کیوں گرفتار کرے۔"

"یہ تجویز زیادہ مناسب ہے۔" لی مورا نے کہا۔

"تو پھر پہلے آپ برآمدے میں دائیں بائیں دیکھ لیں۔"

لی مورا اُٹھا، دروازہ کھولا اور دونوں طرف جھانک کر پھر اندر کی طرف مڑا:

"میدان صاف ہے۔"

"شکریہ۔" وہ بولے اور پھر فوری طور پر کمرے سے نکل آئے۔ لی مورا نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

وہ بے فکری کے عالم میں لفٹ کی طرف بڑھے۔ اچانک لفٹ کا دروازہ کھلا اور اس میں سے چھ پولیس والے نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول تھے:

"ہاتھ اُوپر اُٹھا دو۔" ان میں سے ایک نے سخت لہجے میں کہا۔

انھوں نے مسکرا کر ہاتھ اُوپر اُٹھا دیے:

"اس چوہے کو بھی نکال لو۔" اسی پولیس آفیسر نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ساتھ ہی بھاری قدموں کی آوازیں

سنائی دیں۔ برآمدے کے دُوسری طرف سے بھی پندرہ کے قریب
پولیس والے چلے آ رہے تھے۔

انھوں نے دیکھا۔ لی مورا کے دروازے پر دستک دی
گئی اور ان کی مسکراہٹیں بجھ گئیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ
انھوں نے لی مورا کے کمرے میں ان کی موجودگی کو بھانپ
لیا تھا۔ بس جان بوجھ کر انجان بن گئے تھے، کیوں کہ
اس وقت اگر وُہ کمرے میں داخل ہو جاتے تو انھیں لی مورا
پر پستول تانے دیکھ لیتے۔ اور گرفتار نہ کر سکتے، لیکن اب
جب کہ وُہ لی مورا کے کمرے سے نکل آئے تھے تو لی مورا کو
فوری طور پر کاؤنٹر پر اطلاع دینی چاہیے تھی کہ جن مجرموں
کی تلاش میں پولیس ہے۔ انھوں نے زبردستی اس کے کمرے
میں پناہ لی تھی، لیکن اس اطلاع کے نہ دینے کا صاف مطلب
یہ تھا کہ وُہ ان سے ملا ہوا تھا۔

لی مورا کا دروازہ جُوں ہی کھلا۔ اس کا بازو پکڑ کر
باہر کی طرف جھٹکا دیا گیا۔ وُہ اوندھے منہ برآمدے میں گرا:
"ان لوگوں کو گرفتار کرنا تو کوئی مشکل کام ہی نہیں تھا،
ہمیں تو دراصل ان کے مددگار کی تلاش تھی۔ اور وُہ تم
ہو۔ چوہے کے بچے:"

ان الفاظ کے ساتھ ہی پولیس آفیسر کی ٹھوکر لی مورا کے

سر پر لگی۔ اور ان کے جسموں میں سنسناہٹ ہونے لگی۔
"لے چلو انھیں۔ ان سے بات ہیڈکوارٹر میں ہو گی:" پولیس
آفیسر گرجا۔

انھیں باہر لایا گیا تو ہال میں موجود لوگوں نے تالیاں
بجا کر اپنی پولیس کو مُبارک باد دی۔

ہوٹل سے باہر ایک بند گاڑی تیار کھڑی تھی۔ انھیں اس
میں دھکیل دیا گیا۔ گاڑی کے اندر بھی مسلح پولیس والے
موجود تھے۔ دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا اور گاڑی چل
پڑی۔

انھوں نے دیکھا۔ لی مورا کی ناک سے خُون بہ رہا تھا۔

فارُوق رے فارُوق

"تت — تم — تم کون ہو؟" مُسافر گھبرا گیا۔

"مم — مم — میں انسان ہوں۔" فارُوق بولا۔

"لیکن — تم میرے کمرے میں کیا کر رہے ہو؟"

"آپ کے کمرے کا دروازہ کھُلا تھا — آپ کو یہ بتانے کے لیے اندر داخل ہو گیا تھا — آپ سوتے نظر آئے — اس لیے حفاظت کے خیال سے رک گیا۔"

"اوہ — تو میں آج پھر دروازہ بند کرنا بھول گیا — یہ میری بہت گندی عادت ہے۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"شکریہ۔" فارُوق مسکرایا۔

"شش — شکریہ — کس بات کا؟"

"جس بات کا بھی سمجھ لیں۔" اس نے کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟"

اسی وقت اعلان پھر دہرایا جانے لگا:

"کمرہ نمبر ۵۲۰ کا مُسافر نیچے اُتر آئے اور خود کو پولیس کے
الے کر دے، ورنہ بہت سختی کی جائے گی۔"

"ارے باپ رے — یہ — یہ کیا۔"

"پولیس — پتا نہیں کیا چکر ہے — اس نے ہوٹل کو گھیرے
ں لے رکھا ہے — اور کمرہ نمبر ۵۲۰ کے مُسافر کو نیچے اُترنے
ے لیے کہ رہی ہے، لیکن بھلا وُہ خود اوپر آ کر اس مُسافر
کیوں گرفتار نہیں کر لیتی۔"

"یہ ان کی کوئی چال ہے — ہمارے مُلک کی پولیس بے وقوف
یں ہے — مُجرموں کے ساتھ بلی چوہے کا کھیل کھیلتی ہے،
ر جب جی چاہتا ہے — گرفتار کر لیتی ہے۔"

"اچھا جناب — اب تو آپ جاگ گئے ہیں — کہیں آپ کے
رے کا نمبر ۵۲۰ تو نہیں ہے۔" فارُوق بولا۔

"مم — میرے کمرے کا نمبر — ارے باپ رے — شاید ۵۲۰
ی ہے۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"شاید سے کام نہیں چلے گا — اگر بات یقینی ہے تو میں
ولیس کو اشارہ دے دیتا ہوں کہ ان کا شکار اندر موجود
ہے اور چُوں کر سویا ہوا تھا، اس لیے پولیس کا اعلان
نہیں سُن سکا۔"

"اوہ — لیکن — مَیں — مَیں مُجرم تو نہیں ہُوں — مَیں تو ایک

معزز شہری ہوں ۔ اور ہاں ۔ یاد آگیا ۔ میرے کمرے کا نمبر
۵۴۸ ہے ۔"

"تب تو آپ شکر کریں ۔ ویسے تھوڑا ہی فرق رہ گیا ۔
صرف اٹھارہ کمروں کا ۔" فاروق بولا ۔

"کیا مطلب ؟" وہ چونکا ۔

"کک ۔ کچھ نہیں جناب ۔ مجھے اجازت دیں ۔ پہلے ہی اپنا
کافی وقت ضائع کر چکا ہوں ۔"

"جائیے جائیے ۔" اس نے منہ بنا کر کہا ۔

فاروق باہر نکل آیا ۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا
کرے ۔ ہوٹل مکمل طور پر پولیس کے گھیرے میں تھا ۔
اسی وقت اس نے کمرہ نمبر ۵۴۸ کے مسافر کی آواز سنی :

"اے مسٹر ۔ ادھر آؤ ۔ بات سنو ۔"

فاروق نے مڑ کر دیکھا تو وہ دروازے میں کھڑا تھا اور
ہاتھ سے اشارہ کر رہا تھا ۔

"جی فرمائیے ۔" فاروق نے اس کے نزدیک پہنچ کر کہا ۔

"تم ۔ میں خوف محسوس کر رہا ہوں ۔ کیا تم میرے
ساتھ نہیں ٹھہر سکتے ؟"

"کک ۔ کیا ۔ مطلب ۔ خوف کیسا ۔ آپ تو معزز شہری ہیں ۔"
فاروق بولا ۔

"ہاں بے شک ۔ میں ایک معزز شہری ہوں ۔ لیکن پولیس تو
کسی پر بھی شک کر سکتی ہے ۔"

"اوہو ۔ آپ کے کمرے کا نمبر ۵۳۰ کب ہے ۔" فاروق نے
جھلا کر کہا ۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ تم پولیس کے طریقہ کار
کو نہیں جانتے ۔ سیاح ہو نا ۔" اس نے کہا ۔

"ہاں ! ہوں تو سیاح ہی ۔"

"تو پھر کمرے میں آ جاؤ ۔ ہم ایک ساتھ رہیں گے ۔"

فاروق خوش ہو گیا ۔ بیٹھے بٹھائے پناہ مل رہی تھی ۔
اندھا کیا چاہے ، دو آنکھیں ۔ فوراً کمرے میں داخل ہو گیا ،
اور مسافر نے دروازہ بند کر لیا ۔

"اب اگر پولیس نے تلاشی شروع کی ۔ تو ۔" فاروق بولا ۔

"ہم دونوں ایک دوسرے کو ساتھی ظاہر کریں گے ۔" اس
نے فوراً کہا ۔

"کیا مطلب ۔ آپ ایک سیاح کو ساتھی کس طرح ظاہر کر
سکتے ہیں ؟" فاروق چونکا ۔

"بھئی کر دیں گے ۔ تم میرے ہاں آئے ہوئے ہو ۔
میرا گھر دوسرے شہر میں ہے ۔ میں تمہیں یہاں گھمانے پھرانے
لایا ہوں ۔"

"ہوں! ترکیب زور دار ہے۔ لیکن آپ کو اتنا لمبا چوڑا چکر چلانے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ تو معزز شہری ہیں۔ پولیس کو اپنے کاغذات دکھا دیں گے تو وہ مطمئن ہو جائے گی۔"

"یہی تو مشکل ہے۔ میرے پاس کاغذات نہیں ہیں، دوسرے شہر رہ گئے ہیں۔" اس نے کہا۔

"تب پھر۔ میں آپ کے لیے مددگار کس طرح ثابت ہو سکوں گا؟"

"تمھارے پاس تو اپنے کاغذات موجود ہیں نا؟"

فاروق نے اسے تیز نظروں سے دیکھا، پھر سرد آواز میں بولا:

"میں سمجھ گیا۔"

"کک۔ کیا سمجھ گئے؟"

"تم کوئی جرائم پیشہ ہو۔ میں ابھی پولیس کو اطلاع دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر فاروق نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ارے ارے۔ خبردار۔ گولی مار دوں گا۔" وہ گرجا۔

فاروق چونک کر اس کی طرف مڑا۔ اس کے ہاتھ میں واقعی پستول تھا:

"خبردار۔ فون سے دور ہٹ جاؤ۔ میں پولیس کا سامنا

نہیں کر سکتا۔ اگرچہ میک اپ میں ہوں۔ لیکن میرے پاس کاغذات نہیں ہیں، اس لیے فوراً پکڑا جاؤں گا۔"

"تلاشی شروع ہونے پر بھی تو پکڑے ہی جاؤ گے۔"

فاروق نے منہ بنایا۔

"لیکن میری ایک تجویز ہے۔ اگر تم ساتھ دو تو میں بچ سکتا ہوں۔ اور میں تمھیں ساتھ دینے کے سلسلے میں دس ہزار روپے دے سکتا ہوں۔"

"میں تجویز ضرور سنوں گا، کیوں کہ دس ہزار روپے کمانے کا خیال برا نہیں۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"تو پھر جلدی سے کان ادھر لاؤ۔"

فاروق نے کان اس کے منہ کے قریب کر دیا۔

"میں میک اپ کا ماہر ہوں۔ میں میک اپ کر لیتا ہوں۔ تم سیاح کا لباس اتار دو۔ اس طرح ہم دونوں ایک گھر کے فرد نظر آئیں گے، کیوں کہ جو لباس میں پہنوں گا۔ بالکل اسی کپڑے کا چھوٹے سائز کا لباس میرے پاس موجود ہے۔ وہ تمھارے جسم پر فٹ آ جائے گا۔"

"لیکن جب تک تم میک اپ کرو گے۔ پولیس اوپر آ جائے گی۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"میں میک اپ کرنے میں ایک دو منٹ سے زیادہ نہیں

لگاؤں گا۔ تم اتنی دیر میں غُسل خانے میں جا کر لباس
بدل لو۔ صرف لباس بدل لینے سے ہی تم سیاح نہیں نظر
آؤ گے۔"

"مجھے منظور ہے۔ لیکن تمھارا نام کیا ہے؟" فارُوق بولا۔

"روشے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے بیگ میں سے کپڑے
نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

فارُوق کپڑے لے کر اندر گھس گیا۔ جب وُہ لباس تبدیل
کر کے باہر نکلا تو دھک سے رہ گیا۔ کمرے میں پولیس بھری
ہوئی تھی:

"یہ رہا کمرہ نمبر ۵۲۰ کا مُسافر۔ میں نے اسے خوب چکمہ
دیا ہے۔" روشے نے چہک کر کہا۔

"شکریہ مسٹر روشے۔ آپ بہت کام کے آدمی ہیں اور ہمارے
مُلک کو آپ جیسے لوگوں کی بہت ضرورت ہے۔" پولیس آفیسر
نے کہا۔

فارُوق نے کچھ نہ کہا۔ کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہ
گئی تھی۔ روشے اس کے ساتھ چال چل گیا تھا۔ اب اگر
وُہ پولیس والوں کو بتاتا کہ خود روشے جرائم پیشہ ہے۔ تو
وُہ ہرگز یقین نہ کرتے؛ تاہم اس نے نظر بھر کر روشے
کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ خیر کوئی بات نہیں۔ سمجھ

ں گا تم سے۔ جواب میں روشے بھرپُور انداز میں مُسکرا دیا۔
اور پولیس اسے ہتھکڑی لگا کر کمرے سے باہر لے آئی۔
ے میں فارُوق کو خیال آیا، نہ جانے اس کے والد، محمود
ر فرزانہ کہاں اور کس حال میں ہوں گے۔
ہوٹل سے باہر ایک بند گاڑی کھڑی تھی۔ اسے بند گاڑی
ں بند کیا گیا۔ پھر گاڑی وہاں سے روانہ ہوئی۔ آخر
ڑی رکی۔ اسے نیچے اُتارا گیا۔ گاڑی ایک بڑی عمارت
ے اندر کھڑی تھی۔ اب فاروق کو ایک سمت میں لے جایا
جانے لگا۔ پھر نیچے کی طرف سیڑھیاں اترنا پڑیں۔
ایا اسے کسی تہ خانے میں لے جایا جا رہا تھا۔ اس
ے اسے اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوا؛ تاہم اس نے اپنے
سان خطا نہیں ہونے دیے۔ باوقار انداز میں قدم
ٹھاتا رہا۔ آخر وُہ ایک بڑے کمرے میں داخل ہوتے،
وسرے ہی لمحے وُہ اُچھلا۔ اندر اس کے والد، محمود اور
رزانہ موجود تھے، لیکن کس حالت میں۔ یہ دیکھ کر اس کے
ونگٹے کھڑے ہو گئے۔ انھیں اُلٹا لٹکایا گیا تھا۔ کمرے
ی چھتوں میں لوہے کے بڑے بڑے کڑے لگے ہوئے
ے، ان کڑوں سے زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ ان زنجیروں
ے ان کے پاؤں جکڑے گئے تھے، لیکن زنجیریں کافی اونچی

تھیں۔ گویا ان کے سر فرش سے کافی فاصلے پر تھے۔ ہر ایک کے سر کے نیچے بجلی کا ایک ایک ہیٹر جل رہا تھا۔ گویا ان کے سروں کو آگ کی تپش دی جا رہی تھی ان کے جسم پسینے سے نہائے ہوئے تھے۔ ان کے جسموں سے بہہ کر آنے والا پسینہ سر کے راستے ہوتا ہوا ان ہیٹروں پر گر کر چھن چھن کی آوازیں پیدا کر رہا تھا۔

فاروق لرز اٹھا۔ اس خیال سے نہیں کہ اب اس کا بھی یہی حشر ہونے والا تھا۔ بلکہ ان کی حالت دیکھ کر۔ ان کی بے بسی دیکھ کر ایسے میں ایک آواز گونجی:

"لو انسپکٹر۔ تمہارا دوسرا بیٹا بھی آ پہنچا۔ ہمارے عقل مند اسے بھی پکڑ لائے۔"

انہوں نے بمشکل اپنے سر فاروق کی طرف گھمائے اور پھر پہلی حالت پر کر لیے۔

"اللہ کی یہی مرضی تھی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"مسٹر فاروق۔ کیا تم بتا سکتے ہو۔ یہاں کس لیے آئے ہو"

"سیاحت کرنے۔" فاروق بولا۔

"شاباش فاروق۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ابھی ساری شاباش دھری رہ جائے گی۔ جب یہ بھی لٹکا ہوا نظر آئے گا۔"

"زندہ قوموں پر ایسے لمحات آیا ہی کرتے ہیں۔" محمود نے بلند آواز میں کہا۔

"میں جانتا ہوں۔ تم سب اس کا حوصلہ بلند کرنے کی کوشش کر رہے ہو، لیکن۔ اس بے چارے کا تو پیشاب نکلا جا رہا ہے۔"

فاروق نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا پولیس مین تھا۔ اس کی ایک آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"خوش فہمی ہے تمہاری۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر لمبے پولیس مین نے اشارہ کیا۔ کمرے میں بیس کے قریب پولیس والے تھے۔ ان میں سے دس آگے بڑھے اور فاروق کو جکڑ لیا۔ اس کے دونوں ٹخنے زنجیرے کس دیے گئے۔ پھر اسے چھوڑ دیا گیا۔ اب زنجیر اوپر اٹھنے لگی۔ یہاں تک کہ اس کا سر اتنی ہی اونچائی پر آ گیا جتنی اونچائی پر باقی سر تھے:

"ہیٹر۔" لمبا پولیس مین بولا۔

فاروق کے سر کے نیچے بھی ہیٹر رکھ دیا گیا اور پھر اسے آن بھی کر دیا گیا۔

"ہاں فاروق - تم لوگ یہاں کس لیے آئے ہو؟"

"بتا تو چکا ہوں۔"

"تم لوگ صرف سیاحت کے لیے یہاں نہیں آ سکتے - تمہارے لیے سیاحت کی اور تھوڑی جگہیں ہیں۔"

"تب پھر تم کچھ بھی سمجھ لو۔"

"یہ بات تو تم لوگوں کو بتانا ہی ہو گی - کہ یہاں کس سلسلے میں آئے ہو - نہیں بتاؤ گے تو اسی طرح لٹکے رہو گے، یہاں تک کہ کبابوں میں تبدیل ہو جاؤ گے۔"

"ہمارے کباب تم لوگوں کو مبارک۔" فاروق بولا۔

"جیو فاروق۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ابھی حرارت نے اس کی کھوپڑی کو کھولایا نہیں انسپکٹر، بہت جلد یہ ہمت ہار جائے گا۔"

"کیا میرے بھائی اور بہن ہمت ہار چکے ہیں؟" فاروق نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ بھی ہار جائیں گے۔"

"تب پھر پہلے ان سے سوال کرو، کیونکہ یہ مجھ سے پہلے کے لٹکے ہوئے ہیں - میں تو ابھی آیا ہوں میدان میں۔" فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

"ہم سے یہ کچھ بھی نہیں اگلوا سکے - اور نہ اگلوا سکے

ں۔" فرزانہ نے کہا۔

"لیکن کب تک - تم لوگوں کا صبر کا پیمانہ لبریز ہونے میں ...ت کم وقت لگے گا۔"

"تم اس وقت کا انتظار کرتے کرتے بوڑھے ضرور ہو ...وگے۔" فاروق نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

عین اسی وقت ایڑیاں بجنے کی آواز سنائی دی - ...م پولیس والے دروازے کی طرف گھوم گئے - ایک بہت ...ل ڈول والا آدمی شان و شوکت سے چلا آ رہا تھا -

"آئیے سر۔" لمبا پولیس مین جھک کر بولا۔

تڑاتڑ

"ان لوگوں نے اب تک کچھ بتایا یا نہیں؟"

"ابھی تک نہیں سر۔ لیکن بہت جلد یہ اُگل دیں گے، بے فکر رہیں۔"

"صدر صاحب کا حکم ہے کہ کل ٹھیک سات بجے ان لوگوں کو رعایا کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ رعایا ان کی تکہ بوٹی کرے گی، لہٰذا احتیاط کی جائے۔ کہیں یہ لوگ ہیڈکوارٹر کی اس تجربہ گاہ میں ہی نہ مر جائیں۔"

"او کے سر۔ کیا صدر صاحب کے حکم کا یہ مطلب ہے کہ اگر یہ کچھ نہیں بتاتے تو بے شک نہ بتائیں، لیکن رعایا کے سامنے ان سب کو زندہ حالت میں پیش کرنا ضروری ہے۔"

"ہاں! بالکل یہی بات ہے، کیوں کہ یہ جس غرض کے لیے آئے تھے۔ اب وہ تو پوری نہیں کر سکیں گے۔ لہٰذا

انھیں زیادہ دیر زندہ کیوں رکھا جائے؟"

"ہوں! تجویز معقول ہے۔" لمبا پولیس مین بولا۔

"لہٰذا اگر یہ آسانی سے بتاتے ہیں تو معلوم کر لیا جائے، ورنہ کل صبح رعایا انھیں مزا چکھائے گی۔"

"جی۔ جی بہتر!"

آدھ گھنٹے کے صبر آزما انتظار کے بعد ان کی زنجیریں کھولی جا رہی تھیں اور وہ دھڑام دھڑام فرش پر گر رہے تھے۔

دوسری صبح ان پانچوں کو زنجیروں میں باندھ کر ایک کھلے میدان میں لایا گیا۔ میدان کے چاروں طرف سیڑھیوں کی صورت میں سیٹیں لگائی گئی تھیں۔ ان پر شاید سارے شہر کے لوگ جمع تھے۔ جوں ہی وہ درمیان میں پہنچے، سپیکر پر اعلان کیا گیا:

"آج کا دن کس قدر خوشی کا دن ہے۔ ہمارے چار بدترین دشمن اور ہمارے ملک میں موجود ان کا ایک ساتھی ہمارے قبضے میں ہیں۔ اور اب عوام ان سے اپنا دل بہلائیں گے۔ میں درخواست کروں گا کہ ہر شخص صرف ایک ایک ہاتھ انھیں رسید کرے۔ ایک سے زائد ہاتھ مارنے کا نقصان یہ ہو گا کہ بہت سے شہری لطف اندوز

نہیں ہو سکیں گے اور یہ پہلے ہی مر جائیں گے ۔ یہ سارا کام ایک ترتیب میں ہو گا ۔ ایک طرف سے جانا ہوگا، دوسری طرف سے واپس آنا ہوگا ۔ سب ایک ہی وقت میں نہیں اُٹھیں گے ۔ اب پروگرام شروع کیا جاتا ہے۔ صدر صاحب ابتدا کریں گے ، ان کے پیچھے وزرا ہوں گے اور پھر شہر کے معزز لوگ ۔ ان کے بعد عوام کی باری ہو گی ۔ ان کے سروں پر ہاتھ اس طرح پڑیں گے کہ ایک لمحہ بھی خالی نہ جانے پائے۔"

الفاظ ختم ہو گئے ۔ ایک لمبی قطار ان کی طرف بڑھنے لگی وہ زنجیروں میں کسے کھڑے تھے ۔ لکڑیوں کے ساتھ انھیں اس طرح باندھا گیا تھا کہ بیٹھ یا لیٹ نہیں سکتے تھے ۔ گویا کھڑے کھڑے ہی ان کی زندگی کی شام ہو جاتی ۔

"کیا ہمارا آخری وقت آ چکا ہے ابا جان ؟" فرزانہ نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا ۔

"اللہ کو ہی معلوم ہے فرزانہ ۔" وہ بولے ۔

"ہم اپنے وطن کی خاطر جانیں قربان کریں گے نا ؟" فاروق نے کہا ۔

"ہاں ! بالکل ۔ اس میں کیا شک ہے ۔" وہ بولے ۔

"تب ہمیں کوئی غم نہیں ۔ ہمارے ملک کا بچہ بچہ اس

بات کی گواہی دے گا کہ ہم نے اپنے دین اور اپنے وطن کے لیے جانیں دیں ۔"

"ہاں ۔ ضرور ۔" انسپکٹر جمشید بھرائی ہوئی آواز میں بولے ۔

"محمود ۔ کیا تمھارے ہاتھ اپنے جوتے کی ایڑی تک نہیں پہنچ سکتے ؟" فاروق بولا ۔

"نہیں ۔ پہلے ہی کوشش کر چکا ہوں ۔"

"فرزانہ ۔ کوئی ایسی ترکیب ۔ کہ چاقو ہاتھ لگ سکے ۔" فاروق بولا ۔

"اگر لگ بھی گیا تو کیا ۔ کیا بن جائے گا اُلٹے ٹنگے ہیں ۔"

"بے شک کچھ نہ بنے ۔ ہم ان بدبختوں میں سے چند ایک کو ختم تو کر سکیں گے ۔ گویا بہادری سے لڑتے ہوئے تو جانیں دیں گے ۔"

"تب پھر سنو ۔ میں اپنے پیر کی مدد سے تمھارے جوتے کی ایڑی کھسکا سکتی ہوں ۔ لیکن چاقو ہاتھ میں کس طرح آئے گا ۔" فرزانہ نے جلدی سے کہا ۔

"کم از کم تم ایڑی تو کھسکا دو ۔" محمود بولا ۔

فرزانہ نے کوشش شروع کر دی ۔ اسی وقت ان کے سروں پر ہاتھ پڑنے لگے ۔ تڑا تڑ کی آوازیں گونجنے لگیں ، تڑ تڑ تڑ ۔ لوگ گزر رہے تھے ۔ پورا زور لگا کر ایک

ایک ہاتھ ہر ایک کے سر پر مار رہے تھے۔ گویا ہر شخص کو پانچ تھپڑ مارنے تھے۔ اور انھیں ہر شخص کا ایک ایک تھپڑ کھانا تھا۔ ادھر فرزانہ انتہائی صبر کی حالت میں اپنی کوشش میں مصروف تھی۔ حالاں کہ اس کا اب کوئی خاص فائدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اور پھر فرزانہ کے منہ سے آواز نکلی:

"میں کامیاب ہو گئی۔"

انھوں نے پیچھے کی طرف دیکھا۔ لوگوں کے پیروں سے ذرا ادھر محمود کا چاقو پڑا تھا۔

"ایک کوشش اور۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی کیا مطلب؟" ان کے منہ سے نکلا۔

تڑتڑ کی آوازیں اور لوگوں کے قہقہوں کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے باتیں کرنے کے قابل تھے۔

"میں اپنے پیر کے انگوٹھے اور انگلی کی مدد سے چاقو پکڑ کر اوپر کی طرف جھٹکا دوں گا۔ امید ہے، چاقو کسی قدر اوپر اچھلے گا۔ بس اگر ہم میں سے کسی کے ہاتھ چاقو لگ گیا تو ہم بہت کچھ کر سکیں گے۔ اور کچھ بھی نہیں تو ان میں سے بہت سوں کو تو ٹھکانے لگا ہی دیں گے۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ وہ سائنس دان بھی ہمارے

ہاتھوں مارا جائے۔" انسپکٹر جمشید دبی آواز میں کہتے چلے گئے۔

وہ اپنی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ آخر بہت مشکل سے انھوں نے چاقو انگوٹھے اور انگلی کے درمیان پکڑ لیا اور اوپر کی طرف اچھالا۔ چاقو اچھلا۔ انھوں نے اپنے اپنے ہاتھ پھیلا دیے، پھر فرزانہ نے کہا:

"چاقو میرے ہاتھ میں آگیا ہے۔"

"تو پھر فرزانہ جلدی سے اپنی زنجیریں کاٹ ڈالو۔ اور اس کے بعد میری۔ لیکن ہم اسی طرح کھڑے مار کھاتے رہیں گے۔ جب تک کہ سب کی زنجیریں نہیں کٹ جاتیں۔ زنجیریں بھی ہمارے لیے ہتھیار کا کام دیں گی۔"

"اوہ ہاں!"

فرزانہ کام میں مصروف ہو گئی۔ ان کے سروں پر تڑا تڑ ہو رہی تھی۔ آخر فرزانہ زنجیروں سے آزاد ہو گئی۔ اب اس نے اپنے والد کی زنجیریں کاٹ ڈالیں، جوں ہی ان کا ہاتھ آزاد ہوا۔ انھوں نے چاقو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور زنجیریں کاٹنے لگے۔ آخر سب آزاد ہو گئے۔ موقع پا کر انھوں نے زنجیریں ہاتھوں میں لے لیں۔ انسپکٹر جمشید کے دائیں ہاتھ میں چاقو اور بائیں میں زنجیر تھی۔ لی مورا بھی پیچھے نہیں تھا۔

"حملہ کر دو۔" انسپکٹر جمشید نے انھیں حکم دیا۔
پھر ان کا چاقو والا ہاتھ بجلی کی تیزی سے حرکت میں آیا۔ فضا میں کئی لرزہ خیز چیخیں اُبھریں۔ بہت سے لوگ اچھل اچھل کر گرے۔ اور تڑپنے لگے۔ ایک ہل چل سی مچ گئی۔ اب وُہ میدان سے باہر نکلنے والے راستے کی طرف بھاگے۔ اپنے ہاتھ اور زنجیریں ساتھ ساتھ گھما رہے تھے۔ ان کی زد میں جو آتا گیا، گرتا گیا۔ گولیاں ان پر برسائی نہیں جا سکتی تھیں، کیوں کہ میدان تو عوام سے بھرا پڑا تھا۔ فوری طور پر تو سب لوگوں کو معلوم بھی نہ ہو سکا کہ ہو کیا رہا ہے۔ جب تک پتا چلتا۔ وُہ میدان کا ایک بڑا حصّہ عبور کر چکے تھے۔ ان کے نزدیک آنے والے کٹ کر گر رہے تھے۔ یا ان کے سروں پر زنجیریں برس رہی تھیں۔ زنجیریں موٹی اور وزنی تھیں۔ جس کے لگ جاتیں، وُہ سر پکڑ کر بیٹھتا چلا جاتا۔

آخر وُہ میدان سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ شہر بالکل خالی پڑا تھا۔ سب لوگ تو اس تفریح کے لیے میدان میں پہنچے ہوئے تھے۔ ان کی زنجیروں کی مار اور چاقو کی کاٹ نے لوگوں کو اس حد تک خوف زدہ کر دیا تھا کہ وُہ ان کے نزدیک نہیں آ رہے تھے اور ہاں کچھ

فاصلے پر رہ کر تعاقب ضرور کر رہے تھے۔ ان حالات سے انھوں نے خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا اور سر پر پیر رکھ کر بھاگے۔

ایک بار مُڑ کر جو دیکھا تو پیچھے کوئی نظر نہ آیا۔ وُہ تعاقب کرنے والوں کو بہت دُور چھوڑ آئے تھے۔ شہر کی کوئی عمارت بھی انھیں پناہ نہیں دے سکتی تھی۔ لہٰذا انھوں نے شہر سے باہر کا رُخ کیا۔ وُہ اسی طرف نکلے جس طرف سے شہر میں داخل ہوتے تھے۔ اور پھر ٹیلوں کے درمیان جا کر دم لیا۔ بہت دیر تک وُہ بے سُدھ پڑے رہے۔ آخر آہستہ آہستہ اُن میں سکت آتی گئی اور ان کی زبان ہلنے لگی۔ سب سے پہلے انسپکٹر جمشید بولے:

"کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہوتی ہے۔"

"جی! کیا مطلب۔ آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟" محمود نے فوراً کہا۔

"اس قدر جلد یہ لوگ ہماری آمد سے خبردار نہیں ہو سکتے تھے۔"

"محمود اور فاروق کی وجہ سے تو ایسا نہیں ہوا ابّا جان؟" فرزانہ بولی۔

"محمود نے جو کہانی سُنائی ہے۔ اس کی وجہ سے یہ

لوگ اس حد تک چوکنے نہیں ہو سکتے تھے۔ اور فاروق تو ہم سے یوں ہی الگ ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی گرفتاری کو بھی بہت زبردست اہمیت دی گئی۔ نہیں بھئی۔ کوئی گڑبڑ ضرور ہوئی ہے اور شاید گڑبڑ ہمارے ملک میں ہی کسی جگہ ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے، ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہو۔ خیر۔ اس پر تو بعد میں غور کریں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان حالات میں ہم اس نامعلوم سائنس دان کا سُراغ کس طرح لگائیں۔ میں نے تو سوچا تھا کہ سیاحوں کے رُوپ میں شہر میں گھومیں گے پھریں گے۔ اور آخر سائنس دان کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، لیکن اب ہمارے گھومنے پھرنے کا تو امکان رہا ہی نہیں۔" یہاں تک کہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

"تب پھر۔ کیوں نہ۔ اس وقت ہم واپس چلیں اور اس مہم کے لیے کچھ عرصہ گزرنے پر پھر یہاں آئیں۔" فرزانہ بولی۔

"کم ہمتی کی باتیں نہ کرو۔" محمود نے جل کر کہا۔

"میں نے کم ہمتی کی نہیں۔ عقل مندی کی بات کی ہے۔" فرزانہ نے بھی اسے گھورا۔

"میرے لیے ان حالات میں خاموشی ہی بہتر ہے۔" فارُوق نے منہ بنایا۔

"تم اور خاموش رہ سکو۔ کمال ہے۔" فرزانہ اس کی طرف مُڑی۔

"نہیں بھئی۔ بات اگرچہ عقل مندی کی ہے، لیکن ہم واپس نہیں جائیں گے۔ واپسی ہو گی تو نامعلوم سائنس دان کی مُوت کے ساتھ۔" انسپکٹر جمشید نے فیصلہ سُنایا۔

"تب پھر ایک ترکیب ہے۔" فرزانہ بولی۔

"کیا ترکیب ہے؟"

"ترکیب یہ ہے کہ ہم رات کا انتظار کریں۔ اور رات کے وقت شہر کے کسی اہم آدمی کو اغوا کریں۔ اغوا کر کے اسے یہاں لے آئیں اور اس سے معلوم کریں کہ سائنس دان کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔" فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

"اس ترکیب پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔" محمود نے کہا۔

"تو پھر غور کر لیا جائے۔ ہمارے پاس غور کرنے کے لیے وقت ہے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"سوال یہ ہے کہ اگر اس خاص آدمی کو بھی سائنس دان کے بارے میں معلوم نہ ہو تو۔" فاروق نے کہا۔

"ہم ہاتھ ہی ایسے پر ڈالیں گے۔ جس کو معلوم ہو گا۔" محمود بولا۔

"مثلاً؟" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ملک کے صدر پر۔"

"اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔" فرزانہ نے منہ بنا کر کہا۔

"ہم بھی تو آسان کاموں کے لیے پیدا نہیں ہوئے۔" محمود بولا۔

"اگر اجازت ہو تو میں بھی ایک تجویز پیش کروں۔" فاروق نے اچانک کہا۔

"تم اور تجویز پیش کرو گے؟" فرزانہ نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"ہاں۔ کیوں۔ کیا تمھارے پاس ہی ٹھیکہ ہے اس کا؟" فاروق نے جل کر کہا۔

"بتاؤ بھئی بتاؤ۔ تم بھی بتاؤ۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ہم کیوں نہ دوسرے درجے کے سائنس دان کو اغوا کریں۔ اسے ضرور اصل سائنس دان کے بارے میں

علم ہوگا۔"

"میری معلومات تو یہی ہیں کہ اس کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہے۔۔ ہے تو صرف چند ایک کو۔ جو اوپر کی سطح کے ہیں۔"

"تب پھر صدر صاحب کو ہی اغوا کرنا ہوگا۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

عین اسی وقت انھوں نے بے ہنگم شور کی آواز سنی۔ وہ چونک اٹھے۔ شاید تعاقب کرنے والے یہاں تک پہنچ گئے تھے۔

"تیار ہو جاؤ۔ لیکن ہم پوری کوشش کریں گے کہ دیکھے نہ جا سکیں، تاکہ لڑائی بھڑائی سے محفوظ رہ سکیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

ٹیلے کی اوٹ سے انھوں نے دیکھا۔ مسلح فوجی ٹیلوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے جسموں میں سنسنی کی لہریں دوڑنے لگیں۔ تمام تجاویز ایک طرف رکھ کر پہلا مسئلہ خود کو ان فوجیوں سے بچانے کا پیدا ہو گیا تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انسپکٹر جمشید کی آنکھوں میں الجھن تیرتی نظر آئی، لیکن پھر اچانک وہ مسکرا دیے۔ انھوں نے تینوں کو اشارہ کیا۔ وہ

کان ان کے منہ کے قریب لے آئے۔ کم از کم اس وقت انھوں نے اتنا ضرور خیال رکھا کہ سر آپس میں نہ ٹکرانے پائیں۔

انسپکٹر جمشید کی تجویز سن کر وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

آخری تحفہ

ایک فوجی رائفل چھپائے ان کے ٹیلے کی طرف بھی آ ہی گیا۔ وہ تو تھے ہی انتظار میں، جوں ہی وہ نزدیک پہنچا اس کی دونوں آنکھوں میں ریت آ گری۔ ساتھ ہی انسپکٹر جمشید اسے چھاپ بیٹھے۔ ایک ریت کی مصیبت ہی کیا کم تھی کہ دوسری ٹوٹی۔ وہ جلد ہی اپنے اوسان کھو بیٹھا۔ کن پٹی پر پڑنے والی ہاتھ کی ہڈی نے تو اسے بے ہوش ہی کر دیا۔ اب انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی اس کے کپڑے اتارے اور خود پہن لیے۔ اس کی رائفل ہاتھوں میں تھام لی اور ٹیلے پر چڑھ کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ گویا دشمن کو ٹیلے پر چڑھ کر تلاش کر رہے تھے۔ لیکن ان کی اس حرکت سے فائدہ یہ ہوا کہ دوسرے فوجی اس طرف نہیں آئے، کیوں کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کا ایک ساتھی تو پہلے ہی ٹیلے پر موجود ہے۔ ان

میں سے کسی کی اس طرف کیا ضرورت - ادھر چند منٹ
بعد بے ہوش قیدی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی -
یہ دیکھ کر محمود نے اس کی ناک پر ایک دو ہتھڑ رسید
کر دیا اور وہ پھر ساکت ہو گیا - یہ ترکیب اگر اختیار
نہ کی جاتی تو وہ اس وقت تک فوجیوں کی نظروں میں
آ چکے تھے ، کیوں کہ کتنے ہی فوجی اس طرف کا رخ
کر چکے ہوتے - دائیں بائیں سے گزر کر دوسری طرف
آ جانے والے فوجیوں کی نظروں سے وہ اس طرح بچے
تھے کہ انہوں نے خود کو ریت میں دفن کر لیا تھا -
صرف منہ ، ناک اور آنکھیں ریت سے باہر تھیں ، لیکن جسم
کے اتنے تھوڑے سے حصے دور سے گزرنے والے فوجیوں
کو بھلا کس طرح نظر آ سکتے تھے - اور آخر اس علاقے کی
تلاش مکمل ہو گئی - اس سے پہلے ہی انسپکٹر جمشید ٹیلے سے
اتر آئے تھے اور دوسروں کی نظریں بچا کر خود بھی ریت
میں لیٹ چکے تھے -

آخر فوجیوں کی واپسی شروع ہو گئی - یہاں تک کہ
وہ سب رخصت ہو گئے - اب وہ ریت سے نکلے -
بے ہوش فوجی کو بھی نکالا گیا - اسے ہلایا جلایا گیا -
آنکھیں کھولتے ہی اس نے کہا :

"تم - میں کہاں ہوں ؟"
"شہر سے باہر - ٹیلوں کے درمیان "
"اوہ - تت - تم - تم نے ہی مجھے بے ہوش کیا تھا نا ؟"
"ہاں ! یہ غلطی ہم سے سرزد ہوئی ہے " فاروق نے
گھبرا کر کہا -
"میں تم لوگوں کو کچا چبا جاؤں گا - ابھی اپنے ساتھیوں
کو آواز دیتا ہوں " یہ کہہ کر اس نے ایک چیخ ماری ،
لیکن فوراً ہی انسپکٹر جمشید نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ
دیا اور اس کی چیخ کا گلا گھٹ کر رہ گیا -
"کوئی فائدہ نہیں - تمہارے ساتھی یہاں سے واپس
جا چکے ہیں "
"اوہ !" وہ دھک سے رہ گیا -
"تمہارے کپڑے اب میرے جسم پر ہیں - تمہارے کاغذات
ان کپڑوں کی جیبوں میں موجود ہیں - لہٰذا اب میں تمہارے
شہر میں آزادانہ گھوم پھر سکوں گا "
"اوہ - یہ - یہ بہت برا ہوا "
"تم اپنی فکر کرو " انسپکٹر جمشید مسکرائے -
"کیا مطلب ؟" اس نے چونک کر کہا -
"مطلب یہ کہ تم اس وقت پوری طرح ہمارے قبضے

میں ہو۔ تمھارے لیے کوئی مدد نہیں آئے گی، کیوں کہ تمھارے بارے میں انھیں کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ جلد یا دیر سے اگر معلوم ہو گا۔ تو بھی یہ چیز میرے حق میں جائے گی اور میں اس سے بھی فائدہ اٹھاؤں گا۔"

"وہ کیسے؟" اس نے کہا۔

"میں یہاں سے کچھ فاصلے پر جا کر ایک جگہ بے ہوش ہو کر گر جاؤں گا۔ فوجی اگر تلاش کرتے ہوئے آئے تو مجھے اٹھا لے جائیں گے۔ ورنہ کوئی راہ گیر پولیس کو اطلاع دے دے گا اور پولیس والے مجھے فوجیوں کے حوالے کر دیں گے۔"

"لیکن۔ تم اپنی شکل صورت کا کیا کرو گے؟"

"میں شکل صورت تبدیل کرنے کا ماہر ہوں۔ آدھ گھنٹے کے اندر تمھارا حلیہ اپنا سکتا ہوں۔ بلکہ اب میں یہی کام کرنے والا ہوں۔ لو اپنی آنکھوں سے دیکھو۔"

یہ کہ کر انسپکٹر جمشید ریت میں دبے ہوئے اپنے چھوٹے سے بریف کیس کو نکال لائے اور پھر اس میں سے میک اپ کا ضروری سامان نکالا اور اپنے میک اپ زدہ چہرے پر ایک اور میک اپ کرنے لگے۔ آدھ گھنٹے بعد اس فوجی کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی نظر آئیں۔ اس کے

منہ سے خواب کی سی حالت میں نکلا:

"کمال ہے۔ اب تو میرے گھر والے بھی دھوکا کھا جائیں گے۔"

"ہاں! کیوں نہیں۔ تم کہو۔ تمھارا کیا فیصلہ ہے؟"

"میں کیا کہ سکتا ہوں۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"خیر سنو۔ میں بتاتا ہوں۔ ہم اس ملک کے سب سے بڑے سائنس دان سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تم اس کا پتا بتا سکتے ہو؟"

"ملک کے سب سے بڑے سائنس دان کا پتا۔ ہا ہا ہا۔" اس نے قہقہہ لگایا۔

"خیر تو ہے۔ تم پاگلوں کی طرح کیوں ہنس رہے ہو؟"

"ملک کے سب سے بڑے سائنس دان سے کوئی نہیں مل سکتا۔ یہ خواب ذہن سے نکال دو۔"

"کیوں! ایسی کون سی بات ہے؟"

"کوئی ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ نہ تو ان کا نام کسی کو معلوم ہے۔ نہ پتا۔ فون تو ان کے گھر میں ہے ہی نہیں کہ کوئی بات کر سکے۔ نہ کسی کو ان کا حلیہ معلوم ہے۔ لہٰذا ان حالات میں ان کے بارے میں کیا ... سکتا ہے۔"

"کوئی تو واقف ہوگا ہی۔"

"ہاں! صدر صاحب جانتے ہیں۔ یا چند اور اونچے درجے کے آدمی جانتے ہوں گے۔"

"صدر صاحب تک پہنچنے کا طریقہ بتا سکتے ہو؟"

"بہت مشکل ہے۔ اجازت نہیں ملتی۔ ہاں کسی کے پاس کوئی بہت ہی اہم اطلاع ہو تو اور بات ہے۔ ایسے آدمی کو وہ ملاقات کا وقت ضرور دیتے ہیں۔"

"شکریہ۔ تم سے کئی کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔ اس لیے میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔"

"کیا مطلب۔ کون سا ارادہ؟" وہ چونکا۔

"ارادہ تھا کہ تمہیں دوسری دنیا کے سفر پر روانہ کر دیا جائے۔ لیکن اب ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ بس تمہیں اس وقت تک یہیں رہنا ہوگا۔ جب تک کہ میں واپس نہ آ جاؤں۔ یہ تینوں تمہارا خیال رکھیں گے۔"

"جی۔ کیا مطلب۔ آپ تنہا جائیں گے؟"

"ہاں۔ مسٹر۔ تمہارا نام کیا ہے۔ اور اگر کوئی نمبر وغیرہ ہو تو وہ بھی بتا دو۔ یاد رکھو۔ تمہاری زندگی کی ضمانت اس وقت دی جا سکتی ہے۔ جب میں بخیریت لوٹ آؤں۔ اگر تم نے کوئی غلط بات بتائی تو میں پھنس جاؤں گا

اور انتقام لینے کے لیے یہ تینوں تمہیں ہلاک کر دیں گے۔"

"ن۔ نہیں۔ میرا نام ارماش ہے۔ میرا نمبر ۲۰۳ ہے۔ میرے کاغذات میں بھی یہی لکھا ہے۔"

"اور تو کچھ نہیں پوچھا جائے گا؟"

"نہیں۔ ۲۰۳ ہی بہت کافی ہے۔"

"شکریہ۔ رات کے وقت صدر اپنے محل میں ہوتا ہے یا کہیں اور؟"

"محل میں۔"

"محل کا راستا بتاؤ۔"

وہ انہیں راستا بتانے لگا۔ رات کے گیارہ بجے انسپکٹر جمشید ان سے رخصت ہوئے۔ ان کے پاس کوئی سواری نہیں تھی، تاہم انہیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ اور اس کے ذریعے وہ محل تک پہنچ گئے۔ محل پوری طرح فوجیوں کے گھیرے میں تھا۔ لیکن محافظ فوجی بھلا ایک فوجی کو دیکھ کر کیا چونکتے۔ انہوں نے خوش آمدید کے انداز میں اس کی طرف دیکھا:

"میرے پاس ایک بہت ہی اہم اطلاع ہے۔ ان جگوڑوں کے سلسلے میں۔ میرے ساتھی لاعلمی میں مجھے ان کے قبضے میں چھوڑ کر واپس شہر آ گئے۔ میں نے کئی گھنٹے ان

کے ساتھ گزارے ہیں۔"

"اوہ۔ تب تو آپ کو فوراً صدر صاحب تک پہنچا دینا چاہیے۔" محافظوں کے انچارج نے کہا۔

"یہی تو میں کہتا ہوں۔" وہ بولے۔

بیس منٹ بعد وہ صدر کے سامنے بیٹھے تھے:

"جو اطلاع مجھے دی گئی ہے۔ کیا وہ بالکل درست ہے؟"

"ہاں جناب والا۔ میں نے کئی گھنٹے ان کے ساتھ گزارے ہیں۔"

"لیکن انھوں نے تمھیں چھوڑ کیوں دیا؟"

"انھوں نے چھوڑ نہیں دیا۔ میں ان سے اُلجھ پڑا تھا، اور ان چاروں کو ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہو گیا۔"

"اوہو اچھا۔ تب۔ تو تم ایک بڑے انعام کے حق دار بن گئے۔ تصدیق ہونے پر انعام مل جائے گا۔ کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"مرتے دم تک وہ ایک چیز کو ضائع کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ گویا ان کی کوشش یہ تھی کہ وہ میرے ہاتھ نہ لگ سکے، لیکن میں نے ان کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔"

"اور۔ اور وہ کیا چیز ہے؟"

"یہ رہی سر۔" انھوں نے کہا اور جیب سے ایک گول

سی چیز نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ اس میں عجیب و غریب پنیں لگی ہوئی تھیں۔ اور روشنیاں سی پھوٹ رہی تھیں۔

"یہ ضرور ان کے ملک کی کوئی نئی ایجاد ہے۔ تم یہ میرے پاس رہنے دو۔ صبح ان کی موت کی تصدیق کی جائے گی۔ صبح میرے پاس حاضر ہو جانا۔ اس وقت تم جا سکتے ہو۔ میں ذرا جلدی میں ہوں۔"

"کوئی بات نہیں سر۔" انھوں نے کہا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

محل سے نکل کر وہ ٹیکسی میں بیٹھے، لیکن محل سے ذرا ہی دُور گئے ہوں گے کہ انھوں نے ٹیکسی ڈرائیور کو رکنے کے لیے کہا:

"مجھے ایک کام یاد آ گیا دوست۔"

"کوئی بات نہیں۔" ڈرائیور بولا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے ڈرائیور کے سر پر قیامت ٹوٹی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ انھوں نے اس کی کن پٹی پر ایک جچا تلا ہاتھ مارا۔ ان کے خیال کے مطابق اب وہ کئی گھنٹے تک ہوش میں نہیں آ سکتا تھا۔ اسے ٹیکسی سے گھسیٹ کر سڑک سے کافی دُور ایک درخت کے پیچھے ڈال کر وہ واپس آئے اور ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی کی

لائٹیں بجھا دیں۔ اور محل کے قریب آ گئے۔

چند منٹ بعد ہی ایک لمبی کار محل سے نکل کر ہوا ہو گئی۔ انھوں نے فوراً ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ چوں کہ لائٹیں بالکل بند تھیں۔ اس لیے تعاقب کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔

ان کا سفر صرف سات منٹ جاری رہا، پھر لمبی کار رکتی نظر آئی۔ وہ فوراً ٹیکسی روک کر نیچے اترے اور تیزی سے آگے بڑھے۔ انھوں نے ایک شخص کو کار سے باہر آتے دیکھا۔ قد و قامت کے لحاظ سے وہ صدر ہی جان پڑتا تھا۔ انھوں نے دیکھا۔ وہ ایک چھوٹے سے مکان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور وہ اندر چلا گیا۔ وہ اس مکان کے اور نزدیک آ گئے اور ایک تاریک گوشے میں دبک گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ شخص باہر آ گیا۔ کسی نے اسے رخصت کیا اور دروازہ بند کر لیا۔ اب انھوں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ بلاشبہ صدر ہی تھا، لیکن اب میک اپ میں تھا۔ جوں ہی وہ بیرونی سڑک پر پہنچ کر اپنی کار میں بیٹھا، انسپکٹر جمشید تاریک گوشے سے نکل آئے۔ اور دروازے پر دستک دی۔ اسی وقت صدر

کی کار روانہ ہو گئی۔ دروازہ فوراً ہی کھلا اور انسپکٹر جمشید ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اندر داخل ہو گئے:

"کیا مطلب۔ کون ہو تم؟"

"ایک فوجی۔ میرا نمبر ۲۰۳ ہے۔"

"لیکن تم اس طرح اندر کیوں داخل ہوئے؟"

"دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں۔ کیا آپ مجھے تھوڑی دیر کے لیے پناہ نہیں دے سکتے۔"

"اوہ۔ یہ بات ہے۔ لیکن تم تو اپنے ملک کے فوجی ہو، یہاں تمھارے دشمن کہاں سے آ گئے؟"

"بہت تھک گیا ہوں۔ ذرا اطمینان سے بیٹھ جاؤں تو کچھ بتاؤں بھی۔" انھوں نے منہ بنا کر کہا۔

"آؤ، آؤ۔"

وہ انھیں اندر ایک کمرے میں لے آیا۔ میز پر وہی گول چیز رکھی تھی۔

"یہ۔ یہ کیا ہے؟" انھوں نے حیران ہو کر کہا۔

"تم اس کو چھوڑو۔ اپنی بات کرو۔"

"کیا آپ کوئی سائنس دان ہیں؟"

"میں نے کہا نا۔ تم اپنی بات کرو۔" اس نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"پہلے مجھے ایک فون کرنے کی اجازت دیں۔"

"افسوس۔ میرے گھر میں فون نہیں ہے۔"

"کیا کہا۔ فون نہیں ہے۔ حیرت ہے۔ آج کے دور میں اور فون نہیں ہے۔ کیا آپ بہت غریب ہیں؟"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس ذرا۔" وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

"بس ذرا کیا؟"

"نہیں لگوایا۔ اور کیا۔" اس نے جل کر کہا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"میں تمہیں اپنا نام بھی نہیں بتا سکتا۔ تم یہاں پناہ کے لیے آئے ہو۔ نہ کہ میرے حالات جاننے۔"

"شکریہ جناب۔ مجھے جہاں آنا تھا۔ آچکا۔ آپ ہی اس مُلک کے سب سے بڑے سائنس دان ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"میرے مُلک کے صدر کا حکم ہے کہ میں اس مُلک کے سب سے بڑے سائنس دان کو ختم کر دوں، لیکن اس مُلک کے سب سے بڑے سائنس دان کا کوئی نام تک نہیں جانتا، نہ اس کے گھر فون ہے۔ نہ اس کے پاس کوئی کار ہے۔ نہ اس کے گھر میں اس کے ساتھ کوئی رہتا

ہے۔ اور یہ سب باتیں یہاں پائی جا رہی ہیں۔"

"کیا۔ کیا مطلب؟" وُہ زور سے اُچھلا۔ آنکھیں خوف کے مارے باہر کو اُبل آئیں۔

"یہ چیز۔ جو ابھی ابھی آپ کو صدر صاحب دے گئے ہیں۔ تاکہ آپ معلوم کریں کہ یہ دراصل کیا ہے۔ میں نے ہی صدر صاحب تک پہنچائی تھی۔ تاکہ وُہ اندھا دھند آپ کی طرف دوڑ پڑیں۔ اور میں تعاقب کرکے آپ تک پہنچ سکوں۔ ورنہ تو آپ سے ملاقات بہت ہی مشکل سے ہوتی۔ یہ ہے کل کہانی۔ رہی یہ چیز۔ تو یہ ہمارے مُلک کے پروفیسر داؤد کی ایک چھوٹی سی چیز ہے۔ یہ چھوٹی سی چیز۔ تھوڑی دیر بعد آپ کے اس چھوٹے سے گھر کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی۔ اور ساتھ ہی آپ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، لیکن میرے یہاں سے جانے کے بعد۔"

"نن۔ نہیں۔" وُہ چلّایا۔

"حوصلہ۔ جناب۔ حوصلہ۔" انسپکٹر جمشید مُسکرائے۔

"کک۔ کیا۔ تم۔ انسپکٹر جمشید ہو؟"

"ہاں! اب میں چلوں گا۔ ایک آخری تحفہ اور قبول کریں۔" یہ کہ کر وُہ اچانک آگے بڑھے اور اس کے سر کی پشت

پر دائیں ہاتھ کی ہڈی پوری طاقت سے ماری۔

وہ تڑ سے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ انھوں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ اس آلے کو اس کے جسم کے بالکل ساتھ ملا کر رکھا اور باہر نکل آئے۔ صرف تین منٹ بعد دھماکا ہونے والا تھا۔ وہ باہر نکل کر چند سیکنڈ تک اور انتظار کرتے رہے۔ اور جب انھوں نے دیکھا کہ اب چند لمحے بعد ہی دھماکا ہو جائے گا۔ تو وہ جلدی سے اپنی ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی سڑک پر لا کر روک دی۔ پھر جوں ہی دھماکا ہوا۔ انھوں نے ٹیکسی کو پوری رفتار پر چھوڑ دیا۔

اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچے تو حالات بدستور تھے:

"کیا رہا ابا جان؟" تینوں ایک ساتھ بولے۔

"سب سے بڑا سائنس دان ختم کر دیا گیا۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ ان کے قیدی کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں:

"گگ۔ کیا مطلب؟" وہ چلایا۔

"اور اب ہم یہاں سے چلیں گے۔ مسٹر آپ بھی اب کچھ دیر آرام کر لیں۔" یہ کہ کر انسپکٹر جمشید نے ایک ہاتھ اس کے بھی رسید کر دیا۔

اب وہ اسی راستے سے واپس ہو رہے تھے۔ جس سے گئے تھے اور انسپکٹر جمشید ان سے علیحدہ ہونے کے بعد کی تفصیل سنا رہے تھے۔

"لیکن بے چارے لی مورا کا کیا بنا؟"

"جب ہم زنجیریں کاٹ کر بھاگے تھے۔ اس وقت وہ بھی بھاگا تھا، لیکن اس نے ہم سے الگ بھاگنا مناسب سمجھا تھا۔ لہٰذا ہم بھی کیوں اس کے بارے میں فکرمند ہوں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"گویا۔ ہم کامیاب لوٹ رہے ہیں۔" محمود بولا۔

"لیکن یہ کامیابی ذرا عجیب سی ہے۔ گگ۔ کیوں کہ اس کیس کا سہرا ابا جان۔"

فاروق جملہ مکمل نہ کر سکا، کیوں کہ انسپکٹر جمشید نے اس کے ایک دھپ رسید کر دیا تھا۔

ختم شد